جناح
بمقابلہ
کانگریس
سید احمد حسین
ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی، کراچی

جناح
بمقابلۂ
کانگریس
واقعات وحالات کیا کھویا، کیا پایا کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں۔
اور جب "اپنوں" ہی کا "تجزیہ" موجود ہو تو پھر غیروں کی شکایت کیا!
سیّد احمد حسین

نام کتاب ــــــــ جناح بمقابلہ کانگریس

تصنیف ــــــــ سید احمد حسین

اشاعتِ اوّل ــــــــ یکم جنوری ۱۹۸۸ء

تعداد ــــــــ ۵۵۰

قیمت ــــــــ ۷۰ روپے

سرورق، تزئین و آرائش ــــ مجاہد حمید

مطبع ــــــــ احمد برادرز، ناظم آباد۔ کراچی

ملنے کا پتہ:۔

E-3 کوزی ہومز۔ حسن اسکوائر۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○

(۲۱) سورۃ الروم

"جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں اُن کے لیے
ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں"

بصد احترام معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

کتاب "جناح بمقابلہ کانگریس" کی ترتیب و تدوین میں درج ذیل کتب، رسائل اور موقر روزناموں اور رسالوں کے حوالے بطور سند بصد شکریہ کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں

(۱) شاہ راہ پاکستان بار اوّل اکتوبر ۱۹۶۷ء مصنف - چودھری خلیق الزماں مرحوم

(۲) آوازِ دوست مصنف - جناب مختار مسعود

(۳) محمد علی جناح مصنف - ہیکٹر بولیتھو - مترجمہ جناب زبیر صدیقی

(۴) اقبال کے خطوط جناح کے نام بمعہ دیباچہ حضرت قائد اعظم

(۵) دو قومی نظریہ کے حامی علماء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی - مرتبہ - خواجہ رضی حیدر

(۶) کردار قائد اعظم مصنف - منشی عبدالرحمٰن خان

(۷) آزادی کی کہانی میری زبانی - منسوبہ سردار عبدالرب نشتر مرحوم

(۸) آئینی تعلقات مابین برطانیہ و ہند جلد (۷) " منتقلیٔ اقتدار "

(۹) ڈیول دی وائسرے (ز) جنرل

(۱۰) فیصلۂ ہند (ورڈکٹ آن انڈیا) مصنفہ - بیورلی نکلس

(۱۱) میری جدوجہد مصنف - اڈولف ہٹلر

(۱۲) - "دانائے راز" از پروفیسر ضیاء الدین احمد

(۱۳) "اقبال - جہانِ دیگر" از محترم فرید الحق صاحب ایڈوکیٹ

(۱۴) حوالہ تقریر جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب سابق وزیر قانون، حکومت پاکستان، درون اجلاس مجلس شوریٰ (نیشنل اسمبلی آف پاکستان) ۱۷ جنوری ۱۹۸۲ء

(۱۵) انٹرویو محترم شریف الدین پیرزادہ، سابق وزیر قانون حکومتِ پاکستان، شائع شدہ موقر ہفت روزہ ملت - اسلام آباد - ۱۹ ستمبر ۱۹۷۹ء -

(۱۶) "قائد اعظم کے آخری ایام" ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش

"اپنا وقت دوسروں کی تحریروں کے
مطالعے سے اپنی لیاقت بڑھانے میں صرف
کرو، اس طرح تم ان چیزوں کو نہایت
آسانی سے حاصل کر سکو گے، جن کو حاصل
کرنے میں دوسروں کو محنتِ شاقہ
برداشت کرنی پڑی۔"

(سقراط)

"اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی جی
اور دو سو مولانا آزاد ہوتے اور اُن کے
مقابلے پر کانگریس میں صرف جناح
ہوتے تو مُلک کبھی تقسیم نہ ہوتا"

پیغامِ تعزیت
مسز وجے لکشمی پنڈت

دیباچہ

"قرارداد پاکستان کا مُرتب کون ہے ــــــ؟"

یہ ہے وہ عام سوال جس نے ایک عرصہ سے پاکستان تحریک کو صحیح خطوط پر مدون کرنے والے لوگوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔ حال ہی میں "منتقلی اقتدار ("TRANSFER OF POWER") کی نسبت برطانوی پارلیمنٹ کی اجازت سے شائع ہونے والی "منتخب دستاویزات" پر مشتمل جلدوں کے مُرتب و مدونین PENDEREL MOON اور NICHOLAS MANSERGH بھی اس امر پر خاموش ہیں کہ قراردادِ پاکستان کس نے تیار کی تھی ــــــ شاید اس لیے کہ منتقلی اقتدار کی جلدوں میں صرف "منتخب دستاویزات" ہی کو شامل کیا گیا ہے اور "مُستند" کو یوں نظر انداز کر دیا گیا کہ برطانوی ڈپلومیسی نہیں چاہتی تھی کہ مسلم لیگ اور مسلم ہند کے ساتھ اُن کی بد دیانتی پر لوگوں کی نظر پڑے۔ یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ مطالبۂ پاکستان کی اور دُوسری اہم و مُستند دستاویزات شائد آج پاکستان میں بھی سرکاری طور پر میسر نہیں ہیں کہ ہر بدلتے دورِ حکومت میں ان کو نقصان پہنچا ہے جو تاریخِ پاکستان کی ترتیب و تدوین میں بنیاد کے پتھر کا کام دیتے۔ اب اس کے بعد صرف قیاس و قیافہ شناسی ہی باقی رہ جاتے ہیں اور ظاہر ہے اس ٹامک ٹوئیاں کو بنیاد بنا کر تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ کیوں کہ کوئی بھی "ابجد" سنگِ قرارداد کی چوٹ کھانے تیار نہیں ہے ــــــ وہ سنگِ قرارداد، جو آٹھ لاکھ سروں اور اَن گنت عصمت بربادیوں کا باعث ہے۔ جس کے "سنگِ مینار" کو تاریخِ پاکستان نے "مینارِ پاکستان" کا نام دیا ہے ــــــ ــــــ!

راؔنا اِستعار احمد

اقبال عظیم تھے۔ "روزِ جنوں" کی آڑ میں اسرارِ دروں کہہ کر بھی صلۂ آشفتہ سری کے اُمیدوار رہے اور ایک میں ہوں کہ "اسرارِ دروں" کی بھُلیوں میں کھڑا سوچ رہا ہوں کہ آخر وہ کون تھا جس نے "بیل گنوا کر رسّی لائے" کے مصداق یہ ادھوری اور تباہ کن قرارداد تیار کر کے پاکستانی نقشے کو کنگوری شکل دی؟ ــــــ سکندر حیات ــــــ؟ نہیں۔ نواب اسماعیل ــــــ؟ نہیں۔ عبدالرحمٰن صدیقی ــــــ؟ نہیں ــــــ پھر آخر کون ــــــ؟ کیا مسلم لیگ ڈرافٹنگ کمیٹی کے سینئر رکن چودھری خلیق الزماں؟ نہیں۔ کیوں کہ مرحوم چودھری خلیق الزماں نے ایسی کسی دستاویز کی تیاری سے نہ صرف قطعی لاعلمی و بریّت کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کی منظوری پر سر پیٹ لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چودھری صاحب نے بروقت اس بلنیڈر پر اپنے قائد کو یوں متوجہ نہیں کیا کہ اُن کے خیال میں عین وقت ایسا کرنا مسلم لیگ کو فوری طور پر انتشار میں مُبتلا کرنا تھا ــــــ ایسا انتشار جس سے ممکن تھا مسلم لیگ کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا۔ تو پھر آخر کون ــــــ؟ ــــــ کون؟ یہ ہے وہ سوال جو ہمالہ کے پہاڑوں کی گونج۔ بلوچستان کی وادیوں کی بازگشت اور ساحلِ سمندر کا شور بن کر قیامِ پاکستان سے سوالی ہے ــــــ وہ سوال جس کی معجزاتی شبیہ موٹے قلم سے قرطاس ارض پر اُبھاری گئی ارضی سیاسیات کا وہ بابِ اولین جو اس سے پہلے کبھی رقم نہیں ہوا۔ قلم کا وہ اعجاز جس کی مثال کوئی بھی انسائیکلوپیڈیا دینے سے قاصر ہے۔ لیکن سالہا سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود جس کا جواب تک نصابی کتب میں شامل کرنے کی ہمت نہ ہو سکی کہ اس "قم باذن اللہ" کا رقم کرنے والا کون تھا۔؟ ظاہر ہے "مفروضات" کو بنیاد بنا کر بچھڑے کو معبود تو نہیں بنایا جا سکتا ــــــ کسی ولی خان کی ولائت کا بھرم کر کے ظفر خان کو بخت خاں تو نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ایسا سوچنا بھی فکر کی توہین اور ذہنی دیوالیہ پن کی علامت ہے تو کیا فرزندِ وطن شریف الدین پیرزادہ سابق وزیر

قانون کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے، جو انھوں نے معزز مجلس شوریٰ کے اجلاس ۱۷ جنوری ۱۹۸۲ء کو ذمہ دار حیثیت سے دیا کہ "قرارداد پاکستان کے مرتب محمد ظفر اللہ خان ہیں" ۔۔۔۔۔ ؟ بحد ذمہ دارانہ بیان ہونے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ ایسے عظیم انسان نے جو سیاست عالم کا سقراط، ہندی سیاست کا ارسطو اور برطانوی ڈپلومیسی کا افلاطون تھا جس نے ایک نئے انداز سے "ری پبلک" کی تشریح کر کے اقبال کی "خودی" کو "قرارداد پاکستان" کے باب کی حیثیت سے شامل کیا اس قدر رازداری برتی ہوگی کہ اس کے اپنے سائے فاطمہ جناح کو بھی اس کی خبر نہ ہو سکی یہاں تک کہ وقت کے رپورٹر مطلوب الحسن سید بھی غافل رہے جو قائد کی اہم تحریرات کے ٹائپسٹ تھے ؟ سروجنی نائیڈو کے "براق ذہن، پاکیزہ ادراک" والے قائد کے بارے میں جس نے دنیا کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے کسی سے مشورہ تک نہ کیا ہوگا اور اچانک ہی لاہور سیشن کے دوران ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو ڈرامائی ڈرافٹ نکال کر سبجکٹ کمیٹی سے ضد کی ہوگی کہ وہ اُسے من و عن منظور کر لے ۔۔۔۔ نہیں نہیں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

او بقول ریٹائرڈ بریگیڈیر عبدالرحمٰن صدیقی "اب اگر ان حقائق کا ذکر کیا جائے تو اس پر اکثر یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ بھئی، گڑے مُردے کیوں اکھاڑتے ہو۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر گڑے مُردے نہ اکھاڑنے سے مُراد تذکرۂ ماضی سے احتراز ہے تو پھر تاریخ کہاں جائے گی ؟ تاریخ کا بیشتر حصہ بہرحال ماضی پر مبنی ہے جس کے بغیر تاریخ نہ صرف ادھوری رہ جائے گی بلکہ اس کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

شخصیات کا احترام اور تقدس ایک بات ہے تاہم پاکئی داماں کی حکایت کو اتنا بھی نہ بڑھانا چاہیے کہ انسان انسان کی جگہ فرشتہ نظر آنے لگے۔ نیز تاریخ

کو محض اس لیے بھلا دینا اور اس کو ضبط تحریر میں نہ لانا کہ وہ تلخ حقائق سے بھری پڑی ہے قوم اور تاریخ دونوں ہی کے ساتھ صریحاً زیادتی ہوگی۔ عہد کے ساتھ ساتھ اُحد کے ذکر سے صرف اس لیے گریز نہیں کیا جاتا کہ دوسری کا انجام پہلی سے کمتر تھا۔

ہمارے یہاں ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ شخصیات اور واقعات کے بیان میں اگر راوی آپ کا ہم خیال نہیں تو عموماً اُسے منفی سوچ کا حامل گردانا جاتا ہے دوسرے یہ کہ اگر وہ کسی خاص فرد کے حق میں نہیں تو عموماً اس کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور اس کی تنقید کو ذاتی پسند و ناپسند کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اکثر حالات میں ایسا ہوتا بھی ہو مگر اس کو ایک کلیہ بنا لینا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں۔ کسی بھی شخصیت کے عوامی کردار پر تنقید کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ناقد کو اس سے کوئی ذہنی پرخاش ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ذاتی طور پر کسی شخصیت کا مداح ہوتے ہوئے بھی اصولی طور پر اس سے متفق نہ ہو اور اُسے اپنی تنقید و تجزیہ کا ہدف بنائے۔ تاہم متفق نہ ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ بالضرور اس کے خلاف بھی ہے۔ ذاتی تعصب ایک جگہ ہے اور اس سے سو فیصدی گریز ممکن نہیں پھر بھی ایک مخلص اور دیانتدار ناقد اور تجزیہ نگار کی ہمیشہ یہی کوشش ہونا چاہیے ———— اور ہوتی ہے ....
کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ خواہ وہ فرد ہو یا مضمون، پوری طرح انصاف کرے۔

اب رہا افراد و واقعات کا انتخاب تو اس پر صرف صداقت اور سند کی قید ہو سکتی ہے یعنی حتیٰ الامکان، مؤرخ کی یہی کوشش ہونا چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی پیش کرے، مستند حقیقت کے قریب ہو اور اس میں اس کے اپنے تخیل کا کم سے کم دخل ہو۔ تاہم ذاتی تخیل، تصور یا تعصب کو تاریخ سے خارج کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ انفرادی سوچ اور فہم کے بالکل منافی بھی ہوگا۔ کسی بھی عہد یا شخصیت یا قوم

کہ آج تک ایسی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکی جو اپنی جگہ پر سو فیصد صحیح ہو۔ اگر ایسا ہو سکتا تو پھر ایک ہی موضوع پر مختلف تواریخ کیوں لکھی جاتیں۔ ہر مؤرخ، ناقد اور مصنف کا ایک منفرد زاویۂ نگاہ ہوتا ہے جو اس کے علم و فہم کا نچوڑ ہوتا ہے وہ مجبور ہے کہ کائنات اور موجودات کو اسی نکتۂ نگاہ سے دیکھے۔

دراصل یہ کاوش، یہ پیش کش میری عرصۂ دراز سے زیرِ تحریر کتاب "تیسرے طرز کی پارلیمنٹ" کا بابِ اول ہے جس کا دوسرا حصہ اُس سیاہ دور پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے اور جس کے "اسرارِ دروں" پر بدلتی حکومتوں کے ایسے "مصلحتی" دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں جس کے پیچھے چند غیرتِ ملی کے سوداگر "پردہ نشین" ہیں اور آج بھی مشرقی پاکستان کی میت کے گرد ۱۹۷۱ء کے مجرمین لاکھوں شہیدوں کی نعشوں پر رقصاں ہیں معاہدۂ امن بے غیرتی کے ساتھ" پر ملک کو دو نیم کرنے والے کے دستخطوں کے بعد سے آج تک کوشش بسیار کے باوجود کسی کی اس "شجرِ ممنوعہ" تک رسائی نہ ہو سکی جس کی جڑیں شہیدانِ آزادی کے مقدس خون کی توہین سے پلی بڑھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ذمہ دار شخصیت کے حوالے یا مستند دستاویزات کی عدم موجودگی میں محض تخیل، قیاس آرائی یا صرف مفروضات کی بنیاد پر "تاریخی، اسلامی ناول" تو لکھا جا سکتا ہے تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔

چالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود "منتقلیِ اقتدار" کی طرز پر ہی سہی منتخب دستاویزات" کی ایک جلد تک شائع کرنے کی حکومت جرأت نہ کر سکی کہ کہیں ملک کے ذہین مؤرخ، دانشور مفروضاتی پُل سے خلاء عبور کر کے حقائق تک رسائی حاصل نہ کر لیں

آج بھی "دستور ۱۹۷۳ء" کو آٹھویں آسمان کا صحیفہ سمجھا جا رہا ہے آج بھی دستور ۱۹۷۳ء کی باتیں ہو رہی ہیں "وہ دستورِ ۱۹۷۳ء جو ۱۹۷۱ء کا کفن اور غیرتِ ملی کا تابوت اور مشرقی پاکستان کا مرقد ہے جسے" تاج محل "کا خوبصورت نام دینے کے باوجود دحشتِ مرقدِ نورجہاں نہیں جا سکی!

کیا یہ صرف "خطائے بزرگاں" ہی ہے یا "گرفتن خطا" پر پابندی؟ کیا یہ تاریخ سے انحراف ہے یا ذہنیت کا انعکاس؟ کہیں یہ "..... خسرواں داند" کی دلبری تو نہیں؟ وگرنہ بقول غالب۔

"کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا"

اسی تناظر میں اس کتاب کے بیان کئے ہوئے حالات و واقعات، تخیل و تصور کو دیکھنا چاہیے۔ — بہرحال، قرارداد پاکستان کی تحریر و پیش کش کی نسبت میرا خیال ہے کہ یہ اُن مبہم اور کثیر الوجوہ دستاویزات میں شامل ہے جن میں قطعیت سے کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی اور اُن سے بہت بڑے انقلاب کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

کراچی، ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۷ء

سید احمد حسین

تاریخ تحریکِ پاکستان ایک ایسا موضوع ہے جس پر گزشتہ چالیس بیتالیس سال کے دوران بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اب بھی روزِ اوّل والی کیفیت برقرار ہے۔ ذاتی یادداشتوں سے لے کر دستاویزات کی روشنی تک میں مختلف افراد نے تحقیق کا حق ادا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے لیکن اب تک بعض واقعات ایسے ہیں جن کے ظہور کے بارے میں کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے کہ مفروضوں کی بنیاد پر تاریخ نہیں لکھی جاسکتی، لیکن بسا اوقات مفروضے بھی حقائق تک رسائی کا موثر ذریعہ ثابت ہوجاتے ہیں۔ احمد حسین صاحب اگرچہ بہ اعتبارِ پیشہ معلّم (لکچرر) اُردو شارٹ ہینڈ ہیں۔ لیکن بہ اعتبارِ شوق تاریخ کے دلدادہ۔ انکی پیشِ نظر کتاب [illegible] بمقابلۂ کانگریس" انکے اسی شوق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ہر صاحبِ ذوق اس نتیجے کی روشنی میں احمد

حسین صاحب کے شوق کی فراوانی اور شدت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

احمد حسین صاحب نے اپنی اس کتاب میں بعض ایسے اختلافی اُمور کو چھیڑا ہے جن پر کئی مرتبہ مباحث کا آغاز ہو چکا ہے مگر ہر بار یہ مباحث نتیجہ خیز ثابت ہونے کے بجائے خلط مبحث کی نذر ہو گئے۔ احمد حسین صاحب نے اُن مباحث سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوششیں کی ہے اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں اُن کا نہ صرف مطالعہ وسیع ہے بلکہ تاریخ کی جزئیات پر بھی اُن کی گہری نظر ہے۔ وہ واقعات کی کڑی سے کڑی ملانا اور پھر اُن سے نتائج برآمد کرنا خوب جانتے ہیں۔ اُن کو بخوبی اندازہ ہے کہ مصلحت حقائق کا چہرہ مسخ کر دیتی ہے اور بعض اوقات حقائق اپنی اصل میں بھی بے حقیقت نظر آنے لگتے ہیں۔ احمد حسین صاحب نے تحریک پاکستان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل بعض مصنفین کی آراء کا تعاقب بھی کیا ہے اور بعض مقامات پر تردیدی دلائل اتنے مستحکم دیئے ہیں کہ ان مصنفین کی ارواح بھی ان کی نکتہ رسی کی داد دیتی ہوں گی۔

احمد حسین صاحب کو زبان و بیان پر کمال عبور حاصل ہے۔ وہ با محاورہ لکھتے ہیں جن کی بناء پر بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ طنز کے تیر ان کی تحریر کی جان ہیں مگر اس کے باوجود اُن کا قلم مغالطہ سے پاک اور مبالغہ سے بے نیاز ہے۔ بعض مقامات پر مخصوص افراد کے ضمن میں اُن کا لہجہ بہت سخت ہو گیا ہے۔ یہ صورتِ حال احمد حسین صاحب کی غیر جانب داری کو مشکوک کر دیتی ہے۔ تلخ نوائی کا یہ انداز مو حسین کے یہاں کم اور مبصرین کے یہاں بکثرت ملتا ہے۔ مختار مسعود نے بھی اپنی کتاب "آوازِ دوست" میں "تلخ نوائی" کی ہے، لیکن اس انداز میں کہ قاری کا ذہن بلا خوفِ تردید تمام دلائل کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔

احمد حسین صاحب نے قرار دادِ پاکستان کے حوالے سے جو سوال اُٹھایا ہے

وہ قیامِ پاکستان کے بعد اگرچہ اتنا موثر نہیں رہا لیکن اپنی اصل میں قابلِ غور ضرور ہے۔ اختلافی یا متنازعہ مسائل پر گفتگو کا یہ انداز جو احمد حسین صاحب نے اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی شدت کے باوجود ہمدردانہ اور فی نفسہٖ جذبۂ حبِ الوطنی پر مشتمل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اہلِ رائے اس سے اختلاف کریں اور اسے قبول کرنے سے انکار کردیں، ایسی صورتِ حال میں اپنی بات کہنے والے افراد کو قطعی دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔

خواجہ رضی حیدر

ڈپٹی ڈائرکٹر قائدِ اعظم اکیڈمی

یکم نومبر ۱۹۸۷ء

جناح بمقابلۂ کانگریس

۱۸۵۷ ——— ۱۹۴۷

(" یہ تاریخ تو نہیں ہے ہاں البتہ اُلجھی ہوئی تاریخ کی گرہ کشائی کی کوشش ضرور ہے۔ اس لیے واقعات و حالات، محسوسات و تاثرات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں اور جب "اپنوں" ہی کا "تجزیہ" موجود ہو تو پھر غیروں کی شکایت کیا ——— !")

شجاعت و مردانگی جب ہوش کے بجائے جوش کے حوالے ہو جاتے ہیں تو جنگ بھی جنگ نہیں رہتی ——— "غدر" ہو جایا کرتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے غدر کا انجام نادر شاہ کے قتلِ عام یا ۱۸۵۷ کی تباہی کے سوا، اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ بس فرق اس قدر ہے کہ نادر شاہ کے قہرِ قتال کو خسرو دکن نظام الملک آصف جاہ اول نے روک لیا تھا اور یہاں ہندو بنیا جلتی پہ ادرتیل ڈالتا رہا[1] ——— اس جلتے الاؤ کے بھبھول سے جو چیز صحیح سلامت نکلی وہ صرف سرسید کا دماغ اور "پدرم سلطان بود" کی وہ رسی تھی جو اسلامیانِ ہند کے ہاتھ آئی اور جس کے بل آج بھی نہیں جا سکے۔ چنانچہ ان کی افتادِ طبع کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے لکھا:-

---

(۱) شاہانہ روز قتلِ عام کو رکوانے کیلئے سنہری مسجد دہلی کے صحن میں مغلوب الغضب نادر شاہ کے روبرو آصف جاہ اول کا پڑھا ہوا شعر "کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی - مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی" وقت کی بات ہے۔ صرف ایک شعر نے نادر شاہ کے دل پر جادو کا سا اثر کیا اور اس نے "بہ ریش سفید بخشیدم" کہہ کر تلوار کو نیام کیا اور قتلِ عام بند ہوا۔

"یہ بے ہودہ تعصبات کے غلام ہیں اور اپنا اچھا
بُرا نہیں سمجھ سکتے، علاوہ ازیں، اِن میں باہمی حسد اور
جذبۂ انتقام اور تفاخر ہندوؤں سے زیادہ ہے۔ ہندوؤں
کی نسبت یہ زیادہ غریب بھی ہیں۔ اس لیے میرا خیال
ہے کہ شاید یہ اپنی حالت زیادہ بہتر نہ بنا سکیں۔"

زمام حکومت کمپنی کے ہاتھ سے برٹش پارلیمنٹ کو منتقل ہونے کے بعد لارڈ کننگ (CANNING) وہ پہلا شخص تھا جس نے خونِ غریباں کی اِس سُرخی کو اوّل بار ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک پنجے کی شکل میں ابھرتے ہوئے دیکھا ——— ایک ایسے پنجے کے روپ میں جو جلد یا بدیر برطانوی سامراج کا گلہ دبا دینے والا تھا۔ ۱۸۵۹ میں بحیثیت گورنر جنرل، ہندوستان روانگی سے قبل لندن میں اپنی حکمتِ عملی کا اعلان کرتے ہوئے کننگ CANNING نے کہا:-

"میری خواہش ہے کہ میرے عہدِ حکومت میں، ملک
میں امن و امان رہے۔ لیکن مجھے خطرے کا بھی
پورا احساس ہے کہ ہندوستان کے صاف اور پُرسکون
سیاسی مطلع پر بادل کا ایسا ٹکڑا آ سکتا ہے جو اوّل اوّل
انسان کے پنجہ سے بڑا نہ ہو لیکن جو رفتہ رفتہ پھیل
کر تمام آسمان پر چھا جائے اور ہماری سلطنت کو تباہ
کر دے۔" (۱)

---

(۱) ہیکٹر بولیتھو کی کتاب "محمد علی جناح" (زبیر صدیقی) صہ ۵۹

ایک ایسے وقت جب کہ مسلم جان ارزاں اور مسلم عورت اپنی عصمت کھو چکی تھی۔ داڑ رسن کے سامنے ہندوستان کی آزادی اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کا ایک علیحدہ قوم ہونے کا ادّعا درختوں سے لٹکنے والی نعشوں اور اُگنے والے سروں میں ایک اور کا اضافہ کرنا تھا۔ اگر نہر کے بند صندوقچہ میں سے نکلنے والے موسیٰؑ کا اندازہ فرعون کو ہو جاتا تو شاید بنو اسرائیل کی تاریخ دوسری ہوتی۔ اگر قاتلیں کو معصوم زین العابدینؓ کی رفعت کا ہلکا سا شائبہ بھی ہوتا۔ جو اُن دنوں حضرت یزیدؔ کے یہاں دمشق میں مقیم تھے تو انھیں (۷۲) میں ایک اور کا اضافہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی۔ شاید لارڈ کیننگ CANNING سے بھی ایسی ہی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اگر اُسے کچھ بھی گمان ہوتا کہ لندن میں جس ابھرتے پنجے کو اُس کی نگاہ تصور نے دیکھا تھا وہ دراصل سر سید ہی کا ہاتھ تھا تو اس "تربوز وضع" سر اور "جاٹ نما" ہاتھ کو چشم زدن میں جدا کر کے کسی مرزا مغل کے ہاتھ ملکہ کو بھیج کر سلطنتِ برطانیہ کو تباہی سے بچا لیتا۔ لیکن کیننگ کو جلد ہی اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب سر سید نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر تباہی کی ساری ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت پر ڈال دی۔ یہ پہلا جرأت مندانہ قدم تھا جو اس مردِ عاقل نے اٹھایا ——— وہ قدم ——— وہ پیش قدمی جس نے استبدادی طرزِ حکومت کے دھارے کو پہلی بار لگام دی اور جمہور و جمہوریت، عوام اور عوامی قوت، اتحاد اور اس کی برکت، عزم اور اُس کی منزل سے اہلِ ہند کو عموماً اور اسلامیانِ ہند کو خصوصیت سے روشناس کرایا۔ جس نے اوّل بار خودی و خودشناسی کا وہ درس دیا جو حالی کی مناجات اور اقبال کا ترانہ ہے ——— وہ ترانہ، وہ رجز جس نے بالآخر اُمتِ منتشرۂ ہند کو مسلم لیگ اور مسلم لیگ کو محمد علی جناح اور جناح کو قائدِ اعظم اور قائدِ اعظم کو پاکستان بنا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قدرت نے ۵۷ کی زیادتیوں کا کفارہ سر سید کے روپ میں ادا کر دیا۔ وہ لنکنِ ہند سر سید ہی تھا

جس نے " عوام کی حکومت ، عوام کے ذریعہ ، عوام پر " کے رمزِ حکمرانی کو ہندوستان میں رائج کرایا اور برٹش پارلیمنٹ کو پہلی بار " دو قومی نظریۂ ہند " اور " صوبہ جاتی وفاقی حکومت " کی ضرورت و اہمیت سے روشناس کرائے واضح طور پر مسلم اکثریتی صوبہ جات کی موجودگی اور مجوزہ " وفاقی ہند " میں اس کے باوزنی وجود کو ثابت کیا۔ نوموعود " برٹش انڈیا گورنمنٹ " کے شترِ بے مہار کو نکیل دیتے ہوئے سید جوی نے لکھا۔

" یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ خود حکومت کی بھلائی اسی میں ہے کہ عوام کی آواز حکومت کے ایوانوں اور مجلسوں میں سُنی جاسکے اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ عوام کی نظر میں حکومت کا کوئی اقدام کتنا ہی احمقانہ کیوں نہ ہو وہ اس کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتے۔ نہ اپنی آرزوؤں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جس ملک میں بھی حکومت کی وہاں حکام اور رعایا کے درمیان اظہارِ خیال کا کوئی نہ کوئی سلسلہ ضرور قائم رکھا۔ اس کے علاوہ مسلمان حکمرانوں نے رعایا کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور میل جول بھی رکھا۔ لیکن ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے سب ختم کر دیا اور بالکل نئے ڈھب سے حکومت شروع کی۔ حکومت پر واجب ہے کہ وہ عوام کو اپنا دوست بنائے۔ عوام کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ حکومت کی دوستی اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ برطانوی حکومت کو اس ملک میں سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں آج تک وہ یہاں کے عوام کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکی۔"

دیول دیوی کو آبروِ حرم، جودھ بائی کو بیگم اور جودھ بائی کو بہو بنا کر ہندو راجاؤں کو سسر و ماموں تو بنایا جا سکتا ہے لیکن نتیجے میں اُس بلی کیپ کو وجود پانے سے رُوکا نہیں جا سکتا جو ایسی " رَوا داری " کے صلے میں حاصل ہوا کرتی ہے چنانچہ ایک ہزار سالہ " پریم سبھا " کے نتیجے میں جو نسل ہمارے حصّے میں آئی اُس کی اکثریت فریب خوردہ " پدرم سلطان بود " کہنے والے سُست الوجود جانشینوں کی ناکارہ اولاد تھی[1]۔ اس سارے عرصے میں کسی نے یہ جاننے کی زحمت تک گوارا نہ کی کہ اگر مکّار برہمن ذہن کو مسلم خون کی جسارت مل جاتی ہے تو ۱۸۵۷ء کو روکا نہیں جا سکتا۔ کسی نے اس پر غور تک نہیں کیا کہ خون کی ایسی منتقلی کے نتیجے میں نواکھالی، کلکتہ، بہار، پٹیالہ، دہلی اور بھرت پور وجود میں آیا کرتے ہیں۔ اگر جاٹوں نے یورش کر کے اکبری لاش کی ہڈیاں قبر سے نکال کر روندتے ہوئے جلا ڈالی تھیں اور ۵۷ء کے بعد مسلم ناموس کا ستیاناس مارنے میں ہندوؤں نے بھرپور کردار ادا کیا تھا اور ۱۸۶۷ء میں ہندی تحریک چلا کر مسلم ثقافت اور اردو کی پیٹھ میں خنجر گھونپا گیا تو اس میں برہمن کے اُس تعصّب کو کوسنے کی کیا بات ہے جس نے ہندو ہندوستان کی تاریخ سے ڈھائی سو سالہ تند اَدوَرِ حکمرانی کو محض اس لیے نکال دیا کہ نند خاندان غیر آریائی تھا۔ جس برہمن نے اپنے سوا ساری جاتی کو طبقاتی گروہ بندی میں تقسیم کر کے انسان کو شُودر تک بنا دیا ہو۔ اُس برہمن سے جب بھی افضل خان گلے ملے گا شیوا جی کے خلوص سے لُطف اندوز ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو قومیں اپنی رُوایات کو چھوڑ کر کسی اور قوم کی رُوایات اور طرزِ معاشرت کو اپنا لیتی ہیں وہ رفتہ رفتہ تباہ ہو جایا کرتی ہیں۔ خسروِ دکن نظام الملک آصف جاہ اوّل کا یہ قول آج بھی اوراقِ تاریخ پر

---

(۱) " وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی " (بالِ جبریل)

مینارۂ نور ہے کہ " برہمن چاہے کتنا ہی قابل کیوں نہ اس لائق ہے کہ پھانسی کے پھندے
میں لٹکا دیا جائے "

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی انحطاط کے باوجود مسلمانان ہند کو بہر حال
غیر مسلموں پر علمی و ادبی برتری حاصل تھی جس کا اعتراف جنرل سلیمین[1] نے اپنی کتاب
RAMBKS AND RECOLLCTIONS شائع شدہ ۱۸۳۵ء[2] میں
کیا کہ " ان کے معاصر مسلمان تہذیب اور تعلیمی ترقی میں غیر معمولی طور پر بلند مرتبہ رکھتے
ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم جس قدر وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی
ہے اس قدر دنیا کی اور کسی قوم میں نہیں ہے " لیکن اس کے باوجود سر سید نے
ضرورت محسوس کی کہ مسلم ہند کو تعلیم کے جدید تقاضوں سے بھی روشناس کرانا بیحد
ضروری ہے تاکہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں مسلم ہند کوئی واضح مقام حاصل
کر سکے، جس کی سمت پیش رفت ہندوؤں نے فوراً ہی کر دی تھی۔ مراد آباد اور پھر غازی آباد
میں ابتدائی اسکولوں کا قیام ہی بالآخر " علی گڑھ کالج " اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی
کے قیام کا محرک بنا ـــــ وہ علی گڑھ یونیورسٹی جس کے گریجوٹس کی تعداد
۱۸۸۱ء میں صرف (۴۳) تھی اور دس سال بعد ہی چار سو تک پہنچ گئی۔ جس کی ضیاء
باری نے ایک طرف بنارس کے بتوں کو سرنگوں کر دیا تو دوسری طرف مذہبی
تنگ نظروں کی آنکھیں خیرہ کر کے نہ صرف "لاحول ولا" اور " استغفراللہ!"
کہلوا دیا بلکہ سرسید اور ان کے رفقائے کار کو " کافر - ملحد " اور " کرسٹان " تک
کا خطاب دلوا دیا۔ مگر اس مرد مومن ـــــ اس اللہ کے سپاہی اور عاشق
رسول ؐ نے مخالفتوں کی ذرا پرواہ نہ کی اور مسلم قوم کی قسمتوں کی رہنمائی کرتا رہا۔ خطبات

---

(۱) کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کے وقت نواب واجد علی خان " جان عالم پیا " کے دور انحطاط میں لکھنؤ کا ریذیڈنٹ تھا

(۲) یا ۱۸۴۴ء

احمدیہ“ کی تکمیل کے بعد لندن سے روانگی سے پہلے اپنے دوست سید مہدی علی کو ۲۷ مئی ۱۸۷۰ء کو خط لکھتے ہوئے ان خانقاہی طوطوں کی نسبت لکھا کہ

”جس قدر میں ہمارے ہاں کے مولویوں سے ناراض ہوں ایسا کسی سے ناراض نہیں۔ زندہ مولویوں اور بالتخصیص پنجطوں کا تو جانی دشمن ہوں اور گذشتہ مولویوں میں سے سوائے چند کے، رنجیدہ ہوں۔ کسی کو سوائے چند کے لکھنے اور کتاب تصنیف کرنے اور کسی بات کے تحقیق کرنے کا مطلق سلیقہ نہ تھا۔ جنگل ہیں بھلی اور بری ——— سوکھی اور گیلی لکڑیاں چننے والے تھے۔ خدا ان پر رحم کرے اور ان کی اندھی تقلید کرنے والے اندھوں کو خدا ہدایت کرے۔ اگرچہ تم خفا ہو گئے ——— ہو لو ——— مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی نے نہیں پہنچایا۔ شخصِ اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہرِ قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثلِ یہود و نصاریٰ کے ارباباً من دُونِ اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے۔ آمین۔“

۱۸۷۹ء میں ”مسدسِ حالی“ کی اشاعت نے تو جیسے مسلم ہندوستان میں آگ سی لگا دی۔ وہ آگ جس نے بڑی تیزی کے ساتھ نہ صرف شمالی ہند بلکہ مغرب میں پنجاب اور جنوب میں حیدرآباد دکن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بہت جلد سرسید

مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

۱۶ جنوری ۱۸۸۳ء کو سومنات کا پہلا بُت زمین بوس ہوا جب اِس مُسلم ہیل نے اوّل بار پوتر گیو ماتا کے دھکا مار کے ہندو بالا دستی کو شکست اور برہمن قیادت کے منصوبے کو سبوتاژ کر دیا۔ وائسرائے ہند کی کونسل کے واحد مُسلم نمائندے کی حیثیت سے پہلی بار "دو قومی نظریہ" اور "جُداگانہ طریق انتخاب" کی ضرورت کو پیش کرتے ہوئے سر سید نے کہا:۔

"گورنمنٹ نے کچھ سیٹیں نامزدگی کے لیے مختص کر لی ہیں۔ جس سے اس کا مقصد ہے کہ ملک کی ایسی قوموں کا تحفظ ہو سکے جو اقلیت میں ہیں اور انتخاب میں ان کی کامیابی یقینی نہیں ہوتی۔ چوں کہ انگلینڈ میں تو مذہب کی بنا پر ووٹنگ نہیں ہوتی مگر ہندوستان ابھی تک اس مرض سے چھٹکارا نہیں پا سکا ہے۔ . . . . . . ہندوستان، جو ایک برِّعظیم ہے جس کی وسیع آبادی میں مختلف نسلیں اور مختلف عقائد موجود ہیں اور مذہبی اداروں کے اختلافات نے ہمسایوں کو تک الگ کر رکھا ہے۔ 'ذات پات' کا رواج اب بھی پورے زوروں پر ہے۔ ایک ہی ضلع کی آبادی اگر دولت اور تجارت پر حاوی ہے تو دوسرے کے پاس علم و ثروت ہے۔ ایک تعداد کے اعتبار سے بڑی اور دوسری اس سے چھوٹی۔ ایک کی استعداد ذہنی دوسرے کے مقابلے میں بہت زیادہ اونچی۔ ایک قوم لوکل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی اہمیت سے واقف اور دوسری

ممکن ہے کہ ان چیزوں سے بالکل ناواقف ہو۔"

علیحدہ اصولِ نیابت کی اس تقریر نے جہاں ہندوؤں کے مقابلے میں ایک علیحدہ مسلم قوم کے تصور کو پیش کیا وہاں وائسرائے کی کونسل میں نامزدگی کے طریقہ میں بھی تبدیلی کرکے مسلم حلقۂ انتخاب کی جانب سے نمائندگی کے طریق کار کو رائج کردیا۔ سرسید کی اس معرکۃ الآرا تقریر نے واضح طور پر ہندوستان میں دو قوموں کے وجود کو حقیقت کے روپ میں برطانوی حکومت سے روشناس کرایا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک ۔ سرسید کی تقاریر اور رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" کے گہرے مطالعہ کے بعد ہی ایلن اکٹوین ہیوم نے وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کو مشورہ دیا کہ برطانوی ہند کے آمرانہ طرزِ حکومت میں ایسی تبدیلی کی سخت ضرورت ہے جس کی جانب سرسید نے اشارہ کیا ہے اور جس کی رُو سے ہندوستانی رائے عامہ (ہندو اکثریت) کو انصرامِ حکومت میں جگہ دی جاسکے۔ چنانچہ اس نے لکھا کہ "سرسید احمد خان کی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" پڑھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس کے ذریعۂ "رائے عامہ" کا اظہار ہوسکے۔" اس طرح حبِ مسلم کی آڑ میں بغضِ سباح سے بھرا ہوا الن اکٹوین ہیوم ہی کانگریس کا بانی اور لیڈر ہے۔ الن اکٹوین ہیوم تیس سالہ ملازمت کے بعد ۱۸۸۲ء میں حکومتِ ہند کے سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں اٹاوہ کا وہ کلکٹر تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اس ہندو نواز اور مسلم دشمن شخص نے مسلمانوں کے خون سے خوب ہی ہاتھ رنگے۔ برٹش انڈیا گورنمنٹ کی پالیسی اور لارڈ ڈفرن وائسرائے کی "آشیرواد" سے، اس نے پہلے "انڈین نیشنل یونین" قائم کی اور پھر ۱۸۸۵ء کی کرسمس کے موقعہ پر جماعت کا نام "انڈین نیشنل کانگریس" رکھا۔ پھر اسی کرسمس کے موقعہ پر کُل ہند بنیاد پر ایک کانفرنس کی۔ جس کے سرکلر میں درج تھا کہ "تاج

برطانیہ کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری اس جماعت کا بنیادی مرکزی نقطہ ہے"۔ اگست ۱۹۴۷ء تک کانگریس اس پر عمل پیرا رہی۔ یوں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام سرسید ہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ لیکن بہت جلد انڈین نیشنل کانگریس تنگ نظر ہندوؤں کی آماجگاہ بن گئی اور جب ۲۶ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے دارِفانی سے کوچ کیا ہے تو "عوامی نمائندگی" کا یہ ادارہ ایک ایسے کانگریس مندر کی صورت اختیار کرچکا تھا۔ جہاں "آہنسا" کی مورتی سے مسلمانوں کا گلہ دبانے کا کام لیا جاتا ہو۔ اس گھور اندھیرے میں صرف علی گڑھ یونیورسٹی ہی وہ واحد شمع تھی جو اطراف و جوانب سے اپنے پروانوں کو اکٹھا کررہی تھی۔ صرف پنجاب ہی ایسا مردم خیز خطہ تھا جو سکھوں اور ہندوؤں کے سامنے سینہ تانے کھڑا رہا ورنہ تو بنگال سے لیکر مدراس تک اور بمبئی سے لیکر کشمیر تک مسلمانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ رہی کہ ہندو کانگریس ان کی نمائندگی کی آڑ میں کیسی سنگین اسکیمات کو سینہ میں لیئے بیٹھی ہے۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے بااثر ہندوؤں نے اپنی یک جہتی اور سرمایہ کے زور پر کھلے بندوں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کا ناطقہ نہ بند کیا گیا ہو۔ خصوصیت کے ساتھ بنگال میں مسلمانوں کو شودر بنا کے رکھ دیا گیا۔ حکومتی معاملات میں کانگریس کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو کچھ عرصہ تو لارڈ کرزن برداشت کرتا رہا بالآخر اس نے طے کیا کہ ان کے زور کو توڑنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ سرسید کے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پہلے بہار کو بنگال سے علیحدہ قرار دیکر ہندو اکثریتی صوبے کا دعا کو ختم کردیا جائے اور پھر بنگال اور آسام کا ایک مشترک صوبہ مسلم اکثریت کی بناء پر قائم کرکے کونسل میں مسلم نیابت کو بڑھا دیا جائے۔ کرزن کو کیا معلوم تھا کہ وہ انجانے

میں مشرق میں " پاکستان " کے اولین تخیّل کا بانی بن رہا ہے ۔ چنانچہ پہلی اکتوبر ۱۹۰۵ء کو نواب ڈھاکہ کے محل " احسن منزل " میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ کرزن نے اعلان کیا کہ :-

" میں آپ کو مُسلم صوبہ دینے آیا ہوں جو چٹاگانگ۔
ڈھاکہ - راج شاہی اور بنگال کی کمشنریوں اور آسام
پرمشتمل ہوگا اور بہار کو بنگال سے علیحدہ کرلیا جائیگا ۔"

کرزن کو خیال آیا ہوگا کہ میرے اس اعلان اور مُسلم اکثریت کی بناء پر ایک عظیم مُسلم صوبے کے وجود میں لانے پر یہ سب اُٹھ کر نہ صرف یہ کہ مجھے گلے لگا لینگے بلکہ اس سے شہ پاکر مغرب میں پنجاب، سندھ، سرحد و بلوچستان بھی اپنی بھاری مُسلم اکثریت کی بناء پر صوبائی نیابت کا مطالبہ کردینگے۔ مگر کرزن کو کیا معلوم تھا کہ وہ کن بھاو بھاشۂ بھینسوں کے آگے بین بجا رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ مخاطبین بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے تقریر سُنتے رہے اور ساری گفتگو اور پورا اعلان ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ صرف نواب ڈھاکہ سلیم اللہ خان اور اُن کے چند رفقاء ایسے تھے جنہوں نے لارڈ کرزن کے اس عندیہ کو نوٹ کیا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے توڑ کے لیے ایک علیحدہ مُسلم جماعت کی کس قدر ضرورت ہے۔ چنانچہ یہ تقریر ہی بالآخر دسمبر ۱۹۰۶ء میں مُسلم لیگ کے قیام کا سبب بنی لیکن ہندو بنیئے کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس نے وہ غُل غپاڑہ مچایا کہ کرزن کو اپنی جان بچانی مشکل ہوگئی۔ یہاں تک کہ ہندو پریس اور برطانوی زر خرید اخبارات کے شدید احتجاجات سے متاثر ہوکر ۱۹۱۱ کے دہلی دربار میں جارج پنجم نے تقسیم بنگال کی اسکیم مسترد کردی۔

سرسید کے انتقال کے بعد تو گویا ہندو کانگرس کے گھی کے چراغ جل گئے۔ مُسلمانوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو سرسید کی جگہ لے سکتا۔ لے دے کے پنجاب میں

صرف اقبال تھے مگر وہ اکیلے کر بھی کیا سکتے تھے واسطہ اب انگریز ہی سے نہیں برہمن
تخریبی ذہن سے بھی پڑ گیا تھا۔ اُدھر مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ ان کی سوچ کلرکی سے
اُپر پرواز سے معذور ہو چکی تھی۔ رہ گئے سر والا ذہن لینڈ لارڈز تو ان میں سے ہر
ایک صوبائی گورنر اور وائسرریگل لاج کی دربانی کو سرمایۂ عزت و افتخار سمجھتا تھا۔ کسی
کو "سر" بننے کا خبط تھا تو کسی کو "خان بہادر" کہلانے کا جنون۔ ایسا جنون
جو خرد پر غالب آچکا تھا اور خرد دُور کھڑی کانگرس مندر کی جبہہ سائی کر رہی
تھی۔ ایک ہُو کا عالم تھا جو برصغیر پر چھایا ہوا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندو بنیوں
نے "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا شوشہ چھوڑ کر "آزادیٔ ہند" کے نام پر وہ لاثانی
مہم چلائی جس سے چیک کر نہ صرف علی برادران بلکہ نوجوان جناح بھی پھڑ پھڑا کے
رہ گئے اور پہلی بار ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ سیشن میں جناح "پیغامبرِ اتحاد" کی حیثیت
سے روشناس ہوئے۔ اگر ہندو میتھولوجی کے مسئلہ "آواگون" پر کہیں یقین
کیا جا سکتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ بے چین سر سید کی روح جناح میں حلول کر گئی
تھی، صاف دل ـــــ نوجوان ـــــ شائستہ ـــــ باوقار
دلائل کے ہتیاروں سے مسلح ـــــ!

یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف جناح ہندو اکثریت کی کانگرس
سے سیاسی پلیٹ فارم پر آئے تو دوسری طرف وکیل موہن داس کرم چند گاندھی افریقہ
کی مسلم اکثریتی کانگرس کے پلیٹ فارم سے بحیثیت لیڈر روشناس ہوئے۔
"ناٹال انڈین کانگرس" کا جنوبی افریقہ میں قیام اُس وقت عمل میں آیا جب
۱۸۹۲ میں افریقہ کی ایک مسلم فرم "عبداللہ کمپنی" نے مسٹر گاندھی کو بحیثیت
وکیل و مشیر قانون اپنے یہاں ملازم رکھا۔ عبداللہ کمپنی میں ملازمت مل جانے کے
بعد مسٹر گاندھی اپنی اہلیہ کے ساتھ ۱۸۹۳ میں پہلی بار افریقی شہر پری ٹوریا کی

عدالت میں عبداللہ کمپنی اور کمپنی کے شریک سیٹھ طیب جی کے مقدمہ میں بطور جونیئر وکیل پیش ہوئے اور ایک سال تک پیروی کرتے رہنے کے بعد جب فریقین میں راضی نامہ ہو گیا تو مسٹر گاندھی کو بھی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ اسی دوران جنوبی افریقہ کی غاصب گوری حکومت نے اپنے کالے قانون کے ذریعہ افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کو بھی افریقی باشندوں کے ساتھ عام شہری زندگی اور مراعات میں یورپی اقوام سے نچلی سطح پر ڈال کر حق رائے دہی سے بھی محروم کر دیا۔

ذاتی طور پر مسٹر گاندھی کو دُکھ اُس وقت لگا جب فرسٹ کلاس بوگی میں بیٹھے ڈربن جا رہے تھے۔ اثنا۔ راہ میں چیکر نے ٹکٹ کے بجائے شکل مبارک چیک کرتے ہوئے "دو کالا آدمی" کہکر ٹرین سے اُتار لیا۔ مسٹر گاندھی نے طے کیا کہ وہ اس قانون کے خلاف ایک منظم مہم چلائیں گے۔ چنانچہ سیٹھ عبداللہ اور سیٹھ حاجی محمد کے تعاون سے "ناٹال انڈین کانگرس" قائم کی گئی جس کے اراکین کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جنوبی افریقہ کی اس پہلی سیاسی جماعت کے سیکرٹری کی حیثیت سے انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور (۲۳) سال تک افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کو مراعات دلانے کے لیے کام کرتے ہوئے بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔

اس سارے دور میں مسٹر گاندھی نے اپنی وکیلانہ صلاحیت کو قلابازیاں لگانے

---

(۱) ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو موہن داس کرم چند گاندھی پور بندر کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ عرفاً "مہاتما" پکارے جاتے تھے۔ ان کے والد کرم چند گاندھی ریاست پور بندر کے دیوان تھے۔ بیرسٹر ہو کر لندن سے چلے آئے۔ بمبئی اور راج کوٹ میں وکالت کی لیکن پور بندر کے مشہور میمن خاندان کے تاجر جناب ابو بکر جوہری نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ناتھورام گوڈسے نے عین اُس وقت انھیں ریوالور کی پے بہ پے پانچ گولیاں مار کے ہلاک کر دیا۔ جب وہ اپنی "بھجن منڈلی میں "درس" دے رہے تھے۔

مسٹر گاندہی

کے بار کے طور پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۹ء میں جب برطانوی حکومت اور ایک افریقی قبیلے میں جنگ چھڑ گئی تو "کالوں" کے اس نام نہاد لیڈر نے "گوروں" کا ساتھ دیتے ہوئے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ "برطانوی ہند کی رعایا" کی حیثیت سے انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے "کالوں" کی چمڑی ادھیڑنے میں امداد دیں تاکہ اس "کارگزاری" سے خوش ہو کر گوری افریقی حکومت ہندوستانیوں کو مزید مراعات دے سکے۔ چور کو چوری کا مشورہ دینے کے بعد ساہو کا گھر سنبھالنے کے لیے اس بہروپیے نے گیارہ سو ہندوستانیوں کا ایک "طبّی دستہ" بنا کے اُن زخمیوں کی امداد کا کام پوری تندہی سے شروع کیا جن کی اکثریت بے گور و کفن ہو کر اپنی آبادیوں کو بے چراغ و بے نشان بنا چکی تھی۔

ضمیر چاہے کسی شخص کا ہو، بہرحال ملامت ضرور کرتا ہے اور یہ ضمیر کسی مسلمان کا ہو تو ولی تک بنا دیتا ہے اور اگر کسی کافر کا ہو تو "مہاتما"۔ لیکن یہاں تیسری صورت واقع ہوئی اور بہت جلد مسٹر گاندھی اپنے آشرم کے آسن پر "مہاطمع"[1] کے روپ میں براجمان ہو گئے جہاں انہوں نے "آہنسا" کا پھن پھیلا کر اُس ہندوستانی ناگن کا رُوپ دھار لیا جس کی لمبی اور پتلی زبان کے آگے سے دو حصے ہوتے ہیں، ایک ہندو تعصب اور دوسرا —— انتقام! پہلی کی حد تک "گاندھی ازم" کا یہ اصول قرار دیا کہ :-

> "سارے انسان برابر ہیں۔ انسانیت کی فلاح نسلی امتیاز، نفرت اور تشدّد سے نہیں بلکہ عدم تشدّد اور ہمہ گیر محبت ہی سے ممکن ہے۔"

---

(۱) نواب بہادر یار جنگ مرحوم مسٹر گاندھی کو مہاتما کے بجائے "مہاطمع" لکھا کرتے تھے۔

اس دوستی کی نسبت لکھا کہ :-

"اپنے سفلی ارادوں کو پوشیدہ رکھو۔ اپنے بدترین دشمن پر بھی یہ ظاہر کرو کہ گویا تم اُس کے بہترین دوست ہو اور جب وقت آ جائے تو چہرے سے نقاب اُتار پھینکو اور پوری قوت سے دشمن پر حملہ کر دو ــــــ!"(۱)

۱۹۱۴ء تک "اندرونی نفس" کے اس نار ہونے کی دھوم ہندوستان تک پہنچ گئی۔ ادھر کانگرس کو ایسے ہی کھلاڑی کی ضرورت تھی تاکہ ہندوستانی افضل خان سے معانقہ کرایا جا سکے۔

پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی جب اس دو دھاری "تلوار" نے ہندوستان پہنچ کر اپنا ناٹائی انسو آزمایا ہے۔ چنانچہ انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے مہاتما نے ترپ کا پتہ پھینکا :-

"ہندوستان کے ہر تندرست باشندے کو اس نازک وقت میں سلطنتِ برطانیہ کی امداد کرنی چاہیے کیوں کہ صرف اسی خدمت کے بعد ہندوستان برطانوی سلطنت میں اعزاز کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔"

مہاتما کا چمتکار کامیاب رہا۔ برطانوی حکومتِ ہند نے بہت جلد اس "کالے آدمی" کو دو یا دو فرسٹ کلاس میں بٹھا دیا۔ کانگرس کو اور کیا چاہیے تھا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی ۱۹۱۵ میں پہلے کانگرس کے ممبر بنے اور جلد ہی مہاتمائی آسن پر براجمان ہو گئے۔

---

(۱) "میری جدوجہد" (MEIN KAMPF) "ہٹلر کی پالیسی"

اسے مسٹر گاندھی کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے کہ انھیں انڈین نیشنل کانگرس میں بیحد ذہین، مخلص و مکار اور کروڑ پتی سرمایہ دار اور ہندو پریس کے ساتھ ابوالکلام آزاد جیسے "قوم پرست" عالم اور جمعیت علماء ہند کے بعض زرخرید مولویوں کے ساتھ جو نیلے علی برادران بھی میسر آ گئے۔ لے دے کے کباب کی ہڈی صرف محمد علی جناح رہ گئے تھے جو اس کڑوے کریلے پر چڑھتی ہوئی نیم کو بغور دیکھ رہے تھے وہ براق ذہن محمد علی جناح جن کو مسز سروجنی نائیڈو نے یوں نذرِ عقیدت پیش کی ہے:

"ان کی عظمت کو پرکھنے کا یہ طریقہ تو ہے نہیں کہ ان کی علمیت اور تجربے کے تنوع یا اس کے دائرے کی وسعت کا اندازہ لگانے کی کوششیں کی جائیں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کی براق ذہن اور روح کو ایک بے عیب شائستگی اور پاکیزہ ادراک نصیب ہوا تھا۔ مقاصد کی رنگا رنگی اور دیو قامت شخصیت کا طنطنہ ان کا طرۂ امتیاز نہیں ہے ان کی منزلت تو اس میں ہے کہ انھوں نے مقصد کے معاملے میں رفیع الشان قسم کی یکتائی اور خلوص کا مظاہرہ کیا اور یہ کہ ان کے کردار میں ایک ایسا جادو ہے جو امر ہے جس میں فرض کا ایک تاباں تصور جھلملا رہا ہے اور جسے ذاتی وقار اور قومی زندگی کے معاملے میں دیانت داری کے ایک دل آویز ضابطے نے رونق بخشی ہے۔"

پہلی جنگ عظیم جو ۲ اگست ۱۹۱۴ء کو یورپ میں شروع ہوئی تھی اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ اختتام کی طرف جا رہی تھی۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جب دن کے گیارہ بجے اپنے اختتام کو پہنچی تو امریکہ۔ انگلینڈ۔ اٹلی۔ فرانس اور جاپان کے نمائندوں

نے جرمنی سے زیادہ گت خلافتِ عثمانیہ ترکی کی بنائی جو جرمن محور کا رکن تھا۔ عظیم سلطنتِ ترکی کے چھوٹے بڑے کتنے ہی ٹکڑے کر کے مرزا مغل جیسے عربوں میں بانٹ دیئے گئے۔ خلافتِ عثمانیہ، فی الحقیقت (ملوکیت + سلطنت) اور (سلطانی + خلافت) کا مرکب تھی۔ چنانچہ اس کے "خلافت" ہونے کے دعوئے، حقیقت یا لبادے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند میں اُسے جو "تقدس" حاصل تھا وہ اب بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی و موضوعِ بحث و تنقید ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ترکی سے خلافت کا خاتمہ دو مرحلوں میں کیا گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد چونکہ تحریکِ مزاحمت کی قیادت عملاً مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں میں آ چکی تھی اور مُلک کو تباہی سے انہوں نے ہی بچایا تھا اس لیے اقتدارِ مطلق کے مالک وہی تھے۔ جدوجہدِ آزادی کے دوران ہی "خلیفہ" کی موجودگی میں، ۲۳ راپریل ۱۹۲۰ء کو ترکیہ کی عظیم قومی اسمبلی قائم کردی گئی تھی۔ جنگ کے خاتمے پر جب مذاکرات کا مرحلہ آیا تو سوال پیدا ہوا کہ امن کانفرنس میں ترکی کی نمائندگی کون کرے گا تو "سلطان" نے دعویٰ کیا کہ صرف "اسی کی حکومت" ترکی کی طرف سے مذاکرات میں شرکت کی مجاز ہے۔ کمال اتاترک نے اس دعوے کو مسترد کیا اور کہا کہ اس وقت حاکمیتِ اعلیٰ کی حقیقی علمبردار قومی اسمبلی ہے اور وہی ہر جگہ اپنے مُلک کی نمائندگی کی مجاز ہے۔ نتیجہ یہ کہ اتاترک کی صدارت میں گرینڈ نیشنل اسمبلی نے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کے پہلے مرحلے میں مُلوکیت کے حصہ اوّل سُلطانی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے دو ہفتے بعد "سُلطان" وحیدالدین ایک انگریزی جنگی جہاز میں مُلک سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد عبدالمجید آفندی کو بشکلِ پوپ "خلیفہ" بنا کر ۳ رمارچ ۱۹۲۴ء کے دوسرے مرحلے میں نام نہاد خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔

اِدھر ترکی کی تیزی سے بدلتی صورتِ حال اور بُغض گاندھی و سیاست چانکیہ سے ناواقف سادہ لوح علی برادران نے - بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو"

کا "قومی ترانہ" گاتے ہوئے اُس "خلافت" کی بحالی کی مہم چلادی جو فرانس میں ایڑیاں رگڑ رہی تھی اور جس کا نام تک سُننے کے لیے ترک نوجوان تیار نہ تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں قائم ہونے والی اس جذباتی تحریک نے شمالی ہند اور خصوصیت کے ساتھ مسلم سندھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے قیام کے بارے میں اپنی ذاتی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے چودھری خلیق الزماں نے لکھا کہ :۔

"جلسہ میں کئی ایک تجاویز ترکوں سے ہمدردی اور خلافت کی بقا کے لیے جوش وخروش کے ساتھ منظور کی گئیں۔ تجویز نمبر ۱، یہ تھی کہ ایک آل انڈیا مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی میں قائم کی جائے جس کے صدر سیٹھ چھوٹانی ہوں۔ یہ تجویز میں نے ڈاکٹر انصاری اور دیگر احباب کے مشورے سے تیار کی تھی جس کو قاضی عبدالغفار نے جلسے میں پیش کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے شاید ہی کچھ لوگ واقف ہوں کہ مرکزی خلافت کمیٹی کب اور کن حالات میں قائم ہوئی اور آج یہ حالات میں اپنی قوم کو نہ بتاؤں تو شاید کوئی دوسرا بتانے والا بھی نہ مل سکے"۔

تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف یہ کہ چودھری خلیق الزماں پس پردہ چلے گئے بلکہ علی برادران نے پورے طور پر خلافت کمیٹی کو اپنے قابو میں کر لیا۔ مولانا شوکت علی نے جو اس کمیٹی کے تین سال کے لیے سیکرٹری منتخب ہو چکے تھے۔ بمبئی میں نوجوان سیٹھ چھوٹانی کے لاکھوں روپے کے عطیات اور اپنی شعلہ بیان تقاریر کے ذریعہ سارے ہند میں ایک آگ سی لگادی۔ خاصی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد بھی دردی پوش ہو گئے۔ ان کا حال دیکھ کر ہندی کنویں میں رہنے والے مسلمان مینڈکوں نے

بھی جن کی "غدر" کے بعد حالت بھی نہیں سنبھلی تھی وردیاں پہن کر ادھر ادھر "مارچ" کرتے ہوئے یہ سمجھنا شروع کیا کہ گویا وہ سمندر میں پہنچ گئے ہیں اور کوئی دن جاتا ہے کہ انگریز بھاگ کھڑا ہوگا اور مہاتما جی معہ اپنے کانگریسی چیلوں کے آرتی اُتار کر علی برادران کی تاج پوشی کر دینگے اور پھر سے لال قلعہ "مہابلی" کے جئے کاروں اور نقیبوں کی صداؤں سے گونجنے لگے گا۔

چودھری خلیق الزماں، مسٹر گاندھی کو اس الزام سے بری کرتے ہیں کہ خلافت تحریک میں، مسلم ہجرت کے بارے میں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی فریب کیا ہے۔ برخلاف اس کے خلافت کمیٹی کے ایک جلسے میں جو ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دلّی میں فضل الحق صاحب کی صدارت میں ہوا۔ مسٹر گاندھی نے نہ صرف یہ کہ خود شرکت کی بلکہ اگلے روز صدرِ جلسہ کی حیثیت سے ایک ضروری اعلان کیا:-

> "آصف علی نے اپنے دعوت نامہ میں لکھا ہے کہ "خلافت کے مسئلے کے ساتھ گائے کے تحفظ کا مسئلہ بھی اس جلسے میں طے کیا جائیگا"۔ مگر ہم ہندو اپنی روایات کے پیش نظر اس کو باعزت طریقہ نہیں سمجھتے کہ ایک صحیح مسئلہ میں اپنی ہمدردی کے عوض میں کوئی قیمت مانگیں۔ اگر اس جلسے میں کوئی ایسے ہندو ہیں جو اس خیال سے شریک ہوئے ہیں تو ان کو اپنے دلوں سے یہ نظریہ خارج کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ جو کچھ امداد، ہندو خلافت کے مسئلے میں مسلمانوں کی کرینگے وہ صرف ان کا قومی اور اخلاقی ذمہ داریوں کی بنیاد پر ہوگا، اُسے بلامعاوضہ ہونا چاہیے ترکوں کا مسئلہ انصاف پر مبنی ہے اور اسی حیثیت سے

ہم کو اس کی تائید کرنا چاہیے۔"(۱)

بغضِ گاندھی سے بھری ہوئی یہ ہمدردی ہی چودھری صاحب کی خوش فہمی کا جواب ہے۔ کیوں کہ فریب کے کوئی سینگ نہیں ہوتے ہیں حالانکہ اس احمقانہ تحریکِ ہجرت کے عواقب و عوامل سے مسٹر گاندھی کیا ہر ذی ہوش انسان پوری طرح باخبر تھا۔ مسٹر گاندھی نے اگر ان جذباتی برادران کو لگام ہی دینی تھی تو وہ خود چودھری خلیق الزماں صاحب کی طرح اپنے خطبۂ صدارت میں اس کی حوصلہ شکنی کرتے جس طرح چودھری صاحب نے کی:-

"کچھ جوشیلے اور من چلے لوگوں نے مولانا عبدالباری سے دریافت کیا کہ انگریزوں کی مسلم کش پالیسی کے بعد مسلمانوں پر ہندوستان سے ہجرت فرض ہو جاتی ہے یا نہیں؟

مولانا نے گول مول الفاظ میں اس کا جواب دیا جسے ایک

---

(۱) جب قائد نے کانگریس سے برابری کی سطح پر لکھنؤ پیکٹ کیا تو اس کا مرکزی نکتہ مسلم قومیت کے وجود کا قیام تھا۔ اگر مسلم لیگ کی یہ نشوونما جاری رہتی تو عین ممکن تھا کہ برصغیر کی تقسیم و آزادی کا مرحلہ بیسویں یا تیسویں عشرے میں ہی طے ہو جاتا لیکن تحریکِ خلافت کے طوفان نے اس نشوونما کے سلسلے کو درہم برہم کر دیا۔ نہ صرف تحریک نے مسلمانوں میں ایسی ہیجانی کیفیت پیدا کی جس نے دستور پسند مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو تہہ و بالا کر دیا بلکہ اس کی قیادت کی باگ ڈور گاندھی کے ہاتھوں میں تھما دی۔ خلافت کے لیے گاندھی کی گرم جوشی پر خود ہندو لیڈر حیران تھے۔ لیکن یہ ایک سیاسی چال تھی جس کا مقصد مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم کی پیش رفت کو روکنا تھا، چنانچہ یہی ہوا۔ جہاں مسلم لیگ کی صفیں تتر بتر ہو گئیں وہاں خلافت کی ناکامی سے مایوس مسلمان پہلی بار اجتماعی طور پر گاندھی کی زیرِ قیادت کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں کی (۲۵) سالہ خود تنظیمی کی محنت اکارت گئی اور "ہندوستانی قومیت" کی تعمیر کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔"
(زیڈ۔ اے سلہری۔ "مسائل و افکار" روزنامہ جنگ کراچی۔ ۶ اپریل ۱۹۸۳ء)

طبقہ نے ہجرت کو ایک فریضہ قرار دے دیا[1]۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے الٰہ آباد میں ایک خلافت کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کے لیے میں بھی لکھنؤ سے گیا اور وہاں پہنچ کر ظہور احمد کے یہاں جن کے گھر کے لان پر کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، ٹھہر گیا۔ جب لوگوں نے مجھے جگایا تو میں بھی کمرے کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ مولانا محمد علی اس وقت تقریر کر رہے تھے اور بڑے زوروں سے ہجرت کی تائید فرما رہے تھے۔ جیسے ہی وہ تقریر ختم کر چکے میں نے کھڑے ہو کر کہا کہ "یہ تجویز ایک بہت ہی فرسودہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ اگر ہم آٹھ کروڑ مسلمان انگریز سے اپنے مطالبات نہیں منوا سکتے تو کچھ ہزار مسلمانوں کے ملک سے باہر چلے جانے سے ممکن ہے ہماری تعداد میں کچھ کمی آ جائے مگر انگریزوں پر اس کا رتی برابر بھی اثر نہ پڑے گا اور تجویز زیر بحث خلافت کے مسئلہ کا کوئی معقول حل نہیں ہو سکتی۔" میرے خلاف مجمع سے وہ شور اٹھا کہ میں دروازہ بند کر

---

(1) دراصل مولانا کا یہ "گول مول الفاظ میں جواب" جید عالم دین احمد رضا صاحب بریلوی کے اُس فتوے کے جواب میں تھا کہ "ہندوؤں کے ساتھ موالات ایسے ہی حرام ہے جیسے انگریزوں کے ساتھ"۔ نتیجے میں جو تباہی آئی اُس کا صحیح اندازہ بھی مشکل ہے۔ سب کچھ لٹا کر جب مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہوش میں آئے تو علی برادران سے بھی پہلے، بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم انھوں نے محترم احمد رضا صاحب کے سامنے نہ صرف توبہ ہی کی بلکہ اپنا یہ بیان بھی شائع کرا دیا کہ۔

"مجھ سے بہت سے گناہ ہوئے ہیں۔ کچھ دانستہ، کچھ نادانستہ۔ مجھے ان سب پر ندامت ہے۔ میں مولانا احمد رضا صاحب کے فیصلوں اور فکر پر کامل اعتماد کرتا ہوں۔"

(کتاب :- "دو قومی نظریے کے حامی علماء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی"۔ صفحہ (۱۳))

کے ناشتہ کھانے چلا گیا۔ بعد میں، میں نے سُنا کہ ہجرت
کی تجویز منظور ہو گئی۔"

چودھری صاحب نے لکھا کہ نتیجے میں بیس ہزار مسلمانوں نے ہجرت کی اور تباہ ہوئے۔ شائد چودھری صاحب کے زمانے میں ہمدردی اور فریب ہم معنی ہوا کرتے تھے اور ایسا ہی ہے تو کوئی شک نہیں اس گیانی مہاتما نے مسلمانوں سے پوری پوری ہمدردی کی تھی ______ ! حقیقت تو یہ ہے کہ ماں بی کے ان ہونہار اور فرماں برداروں نے ہجرت کے معاملے میں رام کے بن باس ہونے کے وعدہ کو راجا دسرتھ سے بھی شرمندہ کر دیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ رام اور لکشمن خود بن باس ہو گئے اور یہاں بھگتان کوئی اور بھگتا رہا ______ !

شمالی ہند کے اس "زریں مشورے" کا مسلم سندھ پر بڑا شدید ردعمل ہوا۔ ہزارہا شیدائیان اسلام نے پورے اسلامی جوش اور جذبے کے ساتھ اپنا تعاون پیش کرتے ہوئے بھرپور کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کے مضمون کے مطابق "تحریک پاکستان اور سرزمین سندھ" مطبوعہ جنگ کراچی اگست ۱۹۷۹ء

"یورپ کی استعماری طاقتوں اور خاص طور پر ترکوں کے خلاف انگریزی سازشوں کے پیش نظر خلافت اور حرمین شریفین کا تحفظ ضروری تھا لہٰذا غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں نے ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی۔ سندھ کے مسلمان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ مشہور سیاسی رہنما غلام محمدؒ بھرگری کا کردار اس سلسلے میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ وہ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی فلک گیر قیادت میں کانفرنس کا

ایک شاندار اجلاس اسی سال حیدرآباد سندھ میں منعقد ہوا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد اپریل کے مہینے میں سیہون کے مقام پر دوسرا اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا عبدالکریم درس نے کی۔ اسی سال یعنی ۶۔۷ اور ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو تیسرا اجلاس جو ناقابلِ فراموش تھا لاڑکانہ شہر میں منعقد ہوا جس کی صدارت کے فرائض پیر صاحب جھنڈہ نے انجام دیئے اور ملک کے مقتدر رہنمایانِ ملت مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری لکھنوی اور مولانا ابوالکلام وغیرہ نے شرکت کی۔

۱۹۲۰ء ہی میں تحریکِ خلافت کا ایک اور اجلاس مولانا تاج محمود امروٹی صاحب کی زیرِ صدارت جیکب آباد میں ہوا اور نہایت کامیاب رہا۔ ان جلسوں میں علماء کرام نے انگریزوں کی مسلم دشمن پالیسیوں کو واضح کیا اور ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دیا۔ اسی بناء پر سیہون والے اجلاس میں مسلمانوں نے سندھ سے افغانستان ہجرت کر جانے کی قرارداد کو عملی جامہ پہنادیا۔ سندھ کے تاریخی شہر لاڑکانہ کے نوجوان بیرسٹر جان محمد خان جونیجو نے تحریکِ آزادی کے اس پروگرام میں نہایت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اور انگریزوں کے خلاف اپنی نفرت و حقارت کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ ان کے دیئے ہوئے تمام خطابات و اعزازات واپس کر دیئے اور نتیجتہً سخت مصائب و

پریشانیوں کا شکار ہوئے۔ انگریزی اقتدار نے ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ ان کی زمینوں کا پانی بند کر دیا لیکن موصوف نے ذرہ بھر پرواہ نہ کی اور دیوانہ وار اپنے مقصد کی راہوں پر گامزن رہے۔

ان ہی کی قیادت و رہنمائی میں تحریک آزادی نے سندھ میں انتہائی زور و شور سے کام کیا۔ جیکب آباد والے مذکورہ جلسے کے فوراً بعد سندھ کے ہزاروں مسلمان اپنا مال و اسباب اونے پونے بیچ بیچ کر افغانستان روانہ ہوئے۔ جان محمد خان جونیجو ہی کی سرکردگی میں مہاجرین کی پہلی اسپیشل ٹرین، جولائی ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ سے روانہ ہوئی لیکن افغان حکومت نے تعاون نہیں کیا جس کی بنا پر سندھ کے مسلم مہاجرین کی پہلی بڑی کھیپ انتہا زبردست جانی و مالی نقصان کر کے وطن واپس آگئی ہے۔"(۱)

ظاہر ہے یہ "اونے پونے" گھر بار، مال و اسباب، زمین و جائداد خریدنے والے صرف ہندو ہی تھے۔ یہی حال ہر جگہ اُن مسلمانوں کا ہوا جو ان گردوئی چانم تاروں کی چکر میں آگئے اور جب "آپ میاں مانگتے" کے دروازے پر "ہندی درویشوں" نے یورش کی تو افغان گورنمنٹ نے اِن کے جذبۂ ہجرت سے متاثر ہو کر اپنے اُس روایتی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس کی تعریف حضرت شیخ سعدیؒ نے کی تھی۔ سرحد بند کر دی نتیجہ یہ ہے کہ اماں بی "کی اس فوج کو صوبہ سرحد اور ڈیورانڈ لائن کے درمیان دن کو

---

(۱) جان محمد خان جونیجو نے بقیہ زندگی اجمیر میں ہی گزاری اور وہیں ۲۸ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۲۱ء انتقال کیا اور درگاہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے قریب اناساگر کے کنارے خوابیدۂ راحت ہیں۔ "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں"

تارے نظر آ گئے ـــــــــ وہ تارے جو علی برادران کی ٹوپی پر لگے ہوئے تھے ـ ہیکڑوں افراد، جن میں مرد، عورتیں اور معصوم بچے شامل تھے - ایک تو بھوک - بیماری اور موسم کی سختیوں کے سبب لقمۂ اجل ہو گئے اور جو باقی بچ گئے وہ اس تحریک کے مشیروں اور اس کے رہنماؤں پر لاحول پڑھتے ہوئے جب لوٹے تو انہوں نے دیکھا کہ "خانۂ خالی را دیومی گیرد" کے مصداق اُن کی ملازمتوں، زمین و جائیداد اور گھر بار پر برہمن قابض ہو چکا ہے اور ایک طرف گاندھی جی "مہاتمائی آسن" پہ بیٹھے اپنے ۲۰ نومبر کے زرین مشورے و ہمدردی کی دُھن پر "بندے ماترم" گا رہے ہیں تو دوسری طرف شوکت علی بیٹھے اس جانکیہ کو دیکھ رہے ہیں[۱] ـــــــ ۱۹۲۰ء کا یہی وہ زمانہ ہے جب ہندو مُسلم اتحاد سے مایوس جناح کانگریس مندر سے باہر نکل آیا ـــــــ!

وہ جناح جو سر سید کا جانشین اور حالی کی مناجات کا صلہ تھا ـــــــ

وہ جادو بیاں مقرر جو مُسلم لیگ کے جلسوں میں "بریشم کی طرح نرم" تو کانگریس اور امپیریل کونسل کے اجلاسوں میں "فولاد ہے مومن" کی تفسیر تھا۔ جس نے قومی غلامی میں بھی بادشاہی کی ـــــــ جس نے فرعونی حکومت کے روبرو بھی کلمۃ الحق کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء ہی میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو نے "ضربِ کلیم اللہی" کا پہلا مزا چکھا جب کونسل کے اجلاس کلکتہ میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں سے انگریزوں کے سلوک کا تذکرہ چھیڑا۔

"یہ ایک بڑا تکلیف دہ معاملہ ہے" ـــــــ جناح نے کہا۔

---

(۱) ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ "بعد از خرابیٔ بسیار خواجہ بیدار شُد" کے عنوان ہی سے سہی بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ "مولانا محمد علی جوہر نے بھی اپنی وفات سے تین ماہ قبل مولانا نعیم الدین مراد آبادی (خلیفہ حضرت احمد رضا صاحب بریلوی) کے سامنے اپنی ہندو نواز سرگرمیوں سے توبہ کی۔ چند ماہ بعد مولانا شوکت علی نے بھی ایسا ہی کیا۔"
(دو قومی نظریہ کے حامی علماء، از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی)

"کیوں کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے
جو سنگدلانہ اور ظالمانہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ اُس نے
ملک کے ہر طبقے میں غم وغصے کی لہر پیدا کر دی ہے۔"

وائسرائے نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"فاضل مقرر آدابِ مجلس کا خیال رکھیں۔ لفظ "ظالمانہ"
بہت سخت ہے۔ فاضل مقرر کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ برطانیہ
کے ایک دوست رکن کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں گفتگو
صورتِ حال کے مطابق ہونی چاہیے۔"

جواب ملا۔

جنابِ والا۔ میں اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ کہتا،
لیکن میں موجودہ کونسل کی ہیئت سے بخوبی واقف
ہوں اور نہیں چاہتا کہ ایک لمحے کے لیے بھی حُدود سے
تجاوز کروں، تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ جنوبی افریقہ میں
ہندوستانیوں سے جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ انتہائی
ظالمانہ ہے۔"

وہ جناح ـــــــ جس نے ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کی رکنیت قبول
کی اور ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے "میثاق لکھنؤ" پیش کیا۔
وہ جناح جس کی نسبت ۱۰ر نومبر ۱۹۱۷ء کو نفاذِ اصلاحات کے سلسلے میں ملاقات
کے بعد وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"جناح داخل ہوا ـــــ نوجوان۔ شائستہ۔ باوقار
دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح۔ اپنی اسکیم کی برتری

پرمعرا اور ہٹ دھرم ـــــ وہی ذمہ دار حکومت خود
اختیاری کی اسکیم۔ اس سے کم پر یہ راضی ہی نہیں ہو سکتا
میں پہلے سے تھکا ہوا تھا۔ اس نوجوان نے تو مجھے
بالکل زچ کر کے رکھ دیا۔ چیمسفورڈ (وائسرائے ہند)
نے اس سے بحث میں اُلجھنے کی کوشش کی اور اس
نوعمر سیاستدان نے غریب چیمسفورڈ کو اس بُری
طرح جکڑ کر رکھ دیا جیسے مکڑی اپنے جالے میں
مکھی کو جکڑ لے۔ ذہانت اور فراست جناح کی
خصوصیت ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسا
قابل اور ہونہار آدمی اپنے ملک کے معاملات کی
باگ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا۔"

بالآخر ۱۹۳۵ء میں اس نوعمر سیاستدان نے جواب "پختہ کار مدبّر"
ہو چکا تھا اپنے ملک کے معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ۱۹۳۶ء
کی خود احتسابی تقریر کے دوران قائدؒ نے کہا:۔

"نہ معلوم اُس وقت میری خودداری کو کیا ہو گیا تھا
کہ میں کانگریس کے سامنے ہاتھ پھیلایا کرتا تھا۔
میں نے ہندو مسلم اتحاد کی اس قدر انتھک اور مسلسل
کوششیں کیں کہ ایک اخبار نے یہاں تک لکھ دیا کہ
"مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے سوال سے کبھی بیزار
نہیں ہوتے"۔ لیکن گول میز کانفرنس کے اجلاسوں نے
میری آنکھیں کھول دیں۔ جس میں ہندو روش نے

ایسی صورت اختیار کی کہ میں ہمیشہ کے لیے اس
اتحاد سے مایوس ہو گیا۔"

"ہندو مسلم اتحاد" سے یہ مایوسی کوئی نئی چیز یا اچھوتا انکشاف نہیں تھا۔ سانپ اور نیولے کی یہ دوستی تو اُسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب راجا داہر کو ابنِ قاسم نے کُتر کر پھینک دیا تھا۔ اگر مسٹر جناح ۱۹۰۹ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران اس رمز سے واقف ہوئے تو "صبح کا بھولا شام گھر لوٹ آئے" کی تجدید تھی — ایک ایسی تجدید جو "بعد از خرابی بسیار ہی سہی خواجہ بیدار شُد" کے مترادف تھی جو اگر ہندو نواز فرماں رَوایانِ ہند نے ابتدائی دور ہی میں کر لی ہوتی تو "دو قومی نظریہ" کے پیش کرنے کی ضرورت اُن اکابرینِ ملّت کو پیش نہ آتی — جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ بیسویں صدی میں اسے پیش کیا۔ چنانچہ محترم پروفیسر خلیل اللہ نے اپنے معرکۃ الآرا مقالہ "اقبال اور دو قومی نظریہ" (۱) میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ یہ کوئی نیا یا اچھوتا خیال نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے، سوچنے والے دماغ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کا ملک کی اکثریت کے ساتھ کوئی دوامی اور باعزت سمجھوتہ ممکن نہیں ہے بجز اس کے کہ ان دو قوموں کو برصغیر میں کثرتِ آبادی کی بنیاد پر دو علیحدہ علیحدہ آزاد اور خود مختار خطوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ پروفیسر موصوف نے لکھا کہ:-

"مولانا عبدالحلیم شرر نے جو ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے
اپنے اردو ہفت روزہ اخبار "مہذب" کی اشاعت
۱۲ اگست ۱۸۹۰ء (۲) میں انکشاف کیا کہ اگر ہندو اور

---

(۱) اخبار جنگ کراچی۔ یوم پاکستان ایڈیشن ۱۹۷۸ء
(۲) عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہونے والے ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ۔

مسلمان دو اچھے اور پُرامن پڑوسیوں کی طرح زندگی بسر کرنے تیار نہیں ہیں تو پھر ہندوستان کو، ہندو صوبوں اور مُسلم صوبوں میں تقسیم کر دینا ہی بہتر ہو گا۔"

(۲) "۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہوم (سویڈن) میں بین الاقوامی اشتراکیت کی تحریک کے سلسلے میں ایک کانفرنس ہوئی۔ دو ہندوستانی ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری اس میں مندوبین کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ان مندوبین نے کانفرنس کے متعلق اپنا ایک منصوبہ پیش کیا جس کا لُب لباب یہ تھا کہ ہندوستان کو مذہب کے لحاظ سے مختلف آزاد وحدتوں میں بانٹ دیا جائے۔ اور پھر ان وحدتوں کے ایک یا ایک سے زائد وفاق بنائے جائیں۔"

(۳) "۱۹۲۴ء میں، مولانا حسرت موہانی نے مختلف ہندو رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کے بعد، منصوبہ پیش کیا کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کا قیام دو قومی نظریہ کی بنیاد پر اس طور پر عمل میں لایا جائے کہ مسلم اکثریتی صوبے مُسلم ریاست اور ہندو اکثریت کے صوبے ہندو ریاست بنیں جس کی (مرکزی حکومت) کا انتظام و انصرام ہندوؤں اور مُسلمانوں کے نمائندے مشترکہ طور پر کریں۔"

چودھری رحمت علیؒ نے بھی جو ۱۹۱۵ میں لندن میں مقیم نوجوانوں کی تنظیم کے رہنما تھے خیال ظاہر کیا تھا کہ "شمالی ہندوستان مسلمان ہے اور اسے مُسلمان ہی رہنا چاہیئے۔ اس لیئے مسلمانوں کا "ہندوستانی قومیت" کے تصور سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔"

۱۹۲۰ میں "ہندو مسلم اتحاد" سے مایوس جناح کے کانگریس منڈوے سے باہر نکلتے ہی "پوتر گاؤ ماتا" نے روایتی دُکھتی جھاڑی اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ مسٹر جناح کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کانگریس کی اس آہنسائی حرکت پر ہنسیں یا رو دیں۔ صاف دل اور براق ذہن جناح نے صرف آزادیٔ ہند کی خاطر سوچا کہ ایک آخری کوششیں اتحاد کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ دہلی میں تقریر کرتے ہوئے قائد نے کہا:-

"مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک کوئی ذمہ دار کانگریسی لیڈر مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں کوئی قابلِ عمل فارمولا پیش نہیں کر سکا۔ اِس وقت ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ لگی ہوئی ہے۔ مخلوط انتخابات سے ہم اپنی یہ جنگ نہیں جیت سکتے۔ اگر دونوں قوموں کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ دور ہو جائیں تو یقین جانیے کہ آدھی جنگ جیت جائیں گے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندو فراخ دلی کا ثبوت دیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی کنجی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔"

ہندو کیا خاک فراخ دلی کا ثبوت پیش کرتا جب کہ مہاتمائی ٹولہ اپنی اکثریت کی بناء پر "رام راجیہ" کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مہاتما جی کے لیے "مسلم قوم" اور "جداگانہ حق رائے دہی" کا تصوّر ہی روح فرسا تھا جن کو اُن کی دانست میں نادانی سے کانگریس نے "میثاقِ لکھنؤ" کے روپ میں تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ جلد ہی منعقد ہونے والے عام انتخابات میں ہندو اکثریت کی بناء پر قابض ہو جانے کی چکر میں کانگریس نے جداگانہ انتخابات کے فارمولے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسری بار جناح نے

مختلف الخیال مسلم رہنماؤں کا اجلاس دہلی میں طلب کر کے متفقہ فارمولا پیش کیا کہ اگر:

(۱) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنا دیا جائے۔

(۲) شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات جاری کی جائیں اور

(۳) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دیدی جائے تو مسلمان مخلوط انتخابات کو قبول کر لیں گے اور اپنے اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو وہی مراعات دینگے جو ہندو اپنے اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو دینگے۔

میثاق لکھنؤ کے بعد دوسری بار مئی ۱۹۲۷ء کے کانگریس سیشن بمبئی میں مسرت کے ساتھ ان تجاویز کو قبول کر لیا گیا۔

مگر وہ بنیاء ہی کیا جو بات پر ٹکا رہے۔ چنانچہ سائمن کمیشن سے عدم تعاون کے بعد ۵ رمئی ۱۹۲۸ء کو جناح کے لندن روانگی کے فوری بعد کانگریس نے موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے "آل پارٹیز" کے "دیوالیہ لیڈروں" کا ایک اجلاس بمبئی میں طلب کیا تاکہ ہندوستان کے لیے ایک متحدہ "آئین" کا مسودہ تیار کیا جا سکے۔ کمیٹی کے صدر موتی لعل نہرو نے جو مسودہ تیار کر کے "عوام" کے سامنے پیش کیا اس نے "نہرو رپورٹ" کے نام سے شہرت پائی۔ یہ متیرا موقعہ تھا کہ کانگریس نے دوغلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دہلی تجاویز کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء کے آخری ہفتے میں لندن سے واپسی کے دوران عدن کے مقام پر جناح نے موصولہ "نہرو رپورٹ" کا مطالعہ کیا۔

۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو "آل پارٹیز کنونشن" کلکتہ میں "نہرو رپورٹ" کی مخالفت کرتے ہوئے تیسری بار تجویز پیش کی گئی کہ:۔

(۱) مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی حاصل ہو۔

(۲) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی کم سے کم دس سال کے لیے تناسب آبادی کی بنا پر ہو اس کے بعد اس میں ترمیم کی گنجائش رکھی جائے۔

(۳) قوت مرکز کے بجائے صوبائی حکومتوں کے پاس رہے۔

اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے قائد نے کہا،

"کوئی ملک اس وقت تک آزادی کی جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اکثریت رکھنے والی جماعت اقلیتوں کا اعتماد اور تعاون حاصل نہ کرے۔ جس آئین میں اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہوگا وہ نہ صرف بری طرح ناکام ہوگا بلکہ بغاوت اور خانہ جنگی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔"

باوجود سر تیج بہادر سپرو کی اپیل کے کہ مسلمانوں کی ان تجاویز کو مان لیا جائے چوتھی بار کانگریس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ چونکہ نہرو رپورٹ کو مولانا ابوالکلام آزاد اور متعدد قوم پرست مسلمانوں نے جن میں "جمعیت العلماء ہند" کے "ملاؤں" کی اکثریت بھی شامل ہے۔ مان لیا ہے لہٰذا اس میں نہ صرف یہ کہ تبدیلی نہیں کی جا سکتی بلکہ جناح کی آواز چونکہ متحدہ آواز نہیں ہے اس لیے اگر ۲ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک اس کو تسلیم نہیں کر لیا گیا تو کانگریس "پرامن" تحریک ترک موالات چلائے گی۔ (۱)

۱۹۲۹ء میں، چوتھی بار، ختم حجت کے لیے جناح نے وہ مشہور چودہ [۱۴] نکات پیش کیے۔ جس نے کانگریس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے اور محض اس

---

(۱) "ترک موالات" یعنی گاندھی کی پرامن بائیکاٹ تحریک جس کی تائید علی برادران اور دیگر مسلمان اکابرین کر رہے تھے کہ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی وہ واحد مسلمان عالم تھے جنہوں نے اس تحریک کا نہ صرف تنہا اور بڑی بے باکی سے مقابلہ کرتے ہوئے مسلمانان ہند کو اس فتنے کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ کیا اور نعرہ "ہندو مسلم بھائی بھائی" کی نفی کی اور فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد کی ایسی کوششیں مسلمانوں کی ملی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔" مراسلات - جنگ ۲۴ر اگست ۱۹۸۰ء

خیال ہے کہ مٹی کے اس مادھو کو راہ راست پہ لایا جائے قائد نے لیبر وزیر اعظم مسٹر ریمز میکڈانلڈ کو راضی کیا کہ وہ ہندوستان نمائندین کی ایک گول میز کانفرنس لندن میں طلب کریں تاکہ کسی نتیجے پر پہنچا جا سکے۔ چنانچہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو برطانوی ہند کے پچاس نمائندوں کے ساتھ پہلی گول میز کانفرنس سینٹ جیمز پیلس ہوٹل لندن میں شروع ہوئی جس کا افتتاح شہنشاہ جارج پنجم نے خود کیا۔ لیکن یہ کانفرنس بھی کانگریس کے بائیکاٹ کے نتیجے میں ناکام ہو گئی۔ اور غالباً یہی وہ وقت تھا جب جناح پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ "برہمن چاہے کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اس لائق ہوتا ہے کہ پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا جائے"۔

اور مایوس و دل گرفتہ جناح نے ہندوستان کی سکونت ترک کر کے مستقلاً لندن ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا ______!

جناح کی ہندی سیاست سے علیحدگی بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کے مترادف تھی۔ کانگریس مندر جئے کاروں سے گونجنے لگا۔ اگر ایک طرف مولانا آزاد۔ رفیع احمد قدوائی اور آصف علی بغلیں بجا رہے تھے تو دوسری طرف کانگریسی "مُلّا" مشہورِ عالم فتوے جاری کر کے جناح کو اسی طرح "ملحد" اور "کافر" قرار دے رہے تھے جس طرح کمال اتاترک اور سر سید کو قرار دیا گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "مسلم تاریخ" کے ہر دور میں اِن اسلام" کے ٹھیکیداروں نے بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی کے ساتھ مسلم کفنوں کو خون آلود کیا ہے۔

بوقت موجوده ______ ۱۸۸۳ سے ۱۹۲۹ تک کے اکابرین کے خیالات اور ان کے پیش کردہ عظیم منصوبوں کا جائزہ لیا جائے تو مجموعی حیثیت سے (۲) خیال اور تجاویز سامنے آتے ہیں اور ماننا پڑتا ہے کہ اس تاریک اور گھور اندھیرے میں یہ رہنمائی خالصتاً کسی ذہن کی پیداوار سے زیادہ وہ اشارہ ہے جو صرف قدرت

ایسے مواقع پر یہ کرتی ہے۔ جب انسانی عقل مفلوج ہو کر رہ جائے اور جسے عرف عام میں "وحی القا" یا "چھٹی حس کی رہنمائی" کہا جاتا ہے۔ وہی "وحی" جو شہد کی مکھی کو دی گئی تھی حالانکہ شہد کی مکھی کوئی نبی نہیں ہوا کرتی ہے کہ "پاک ہے وہ ذات جس نے شہد کی مکھی کو وحی کی" اب یہ انسانی ذہن اور دماغی صلاحیت کا کام ہے کہ وہ اس کی روشنی میں واضح لائحہ عمل مرتب کرے۔

اوروں سے قطع نظر اگر صرف محترم عبدالحلیم شرر و ڈاکٹر جبار خیری اور مولانا حسرت موہانی کے منصوبوں کو سامنے رکھا جائے تو مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبہ جات کی فیڈریشن سامنے آتی ہے یعنی شمال میں کشمیر، مغرب میں پنجاب سرحد، بلوچستان اور سندھ کی ایک اکائی اور مشرق میں صوبۂ آسام اور صوبۂ بنگال جس کی پہلی پیش کش ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے کر دی تھی۔

کانگریس کے مقابلے میں مسلمانوں کی بدنصیبی یہ تھی کہ "مسلم رہنماؤں" میں سے ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا رکھی تھی اور کوئی بھی کسی ایک کی قیادت پر یوں متفق نہ ہوتا تھا کہ یہ تمام جماعتیں خالصتہً ذاتی، گروہی اور علاقائی مصلحتوں کی بنیاد پر قائم تھیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کی حریف بھی تھیں۔ ان کے "لیڈروں" کی اکثریت یا تو اُن مفاد پرستوں پر مشتمل تھی جو جلی رسّی کے بل پر نواب یا نواب زادے، راجہ یا خان بہادر اور SIR یا پیر قسم کے جاگیردار یا زمیندار تھے یا پھر کانگرس کے کاسہ لیس "علماء کرام" کے زمرے میں شامل تھے۔ حالانکہ دوسری طرف کانگرس سے تعلق رکھنے والے "مہاطبع" کی ہر بات کو بلا حیل و حجت جنرد دھرم" بنائے ہوئے تھے۔ لندن کی پہلی گول میز کانفرنس جو قائد کی تحریک پر منعقد ہوئی تھی ابھی عدم استحکام و اتحاد کے سبب ناکامی کا شکار ہوئی جب کہ کانگرس نے متحدہ طور پر اس کا بائیکاٹ کیا۔

اور اگر مسلم لیگ میں کچھ "مسلم زعماء" شامل بھی رہے تو وہ آگے کو بڑھتے ہوئے پیچھے کو دیکھنے کے عادی تھے "تاکہ یکلخت کسی بدلتی صورتِ حال سے سامنا ہونے کی صورت میں فرار کی راہ کھلی رہے۔ یہی وہ اسباب تھے، جن سے دل برداشتہ ہو کر جناح نے مستقلاً لندن میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لے دے کے اب صرف علامہ اقبال رہ گئے تھے جو مسلم تقدیر کی رہنمائی کے فرائض ادا کر رہے تھے مگر ان کے لیے بھی دشواری یہ تھی کہ وہ "سیاست داں" کی تعریف میں داخل نہیں تھے اس لیئے انہوں نے ہمیشہ اس بات کو محسوس کیا کہ مسلمانانِ ہند کو اگر کوئی قوت اس گرداب بلا سے نجات دلا سکتی ہے تو وہ صرف محمد علی جناح کی ذات ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو "زگ زیگ گاندھی" کو اس کی چانکیائی بساط پر پیدل مات دے سکے۔ غالباً یہ وہ حالات تھے جن میں علامہ اقبال نے جناب عبدالحلیم شرر اور ڈاکٹر جبار خیری کے تصورات سے استفادہ کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد کے اجلاس منعقدہ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اپنا وہ مشہور خطبۂ صدارت پیش کیا جو ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے مطالبہ تقسیم ہند کی بنیادی پالیسی کے طور پر منصۂ شہود پر آیا اور جس کے سامعین کی اکثریت اُن موٹی عقل جاگیرداراور خطاب یافتہ سَروں اور خان بہادروں پر مشتمل تھی جن کے سَروں پر سے یہ عالی شان خطبہ یوں گزر گیا جیسے ۱۹۰۵ء میں گورنر جنرل لارڈ کرزن کی تقریر احسن منزل کے اجتماع پر سے گزر گئی تھی۔ علامہ اقبال نے اپنے طویل خطبۂ صدارت میں "ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان" کا تجزیاتی تصور پیش کرتے ہوئے کہا کہ:-

"۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی

نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف
اقوام کا وطن ہے جس سے نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے
الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا
جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے
تو ہندوستان بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں، پس یہ امر کسی طرح بھی
نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان کے
اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم
کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس
کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کیے بغیر ان سے ایک
متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنی
ان صلاحیتوں کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔ مجھے یقین
ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں نہایت
شدومد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی
ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبۂ سرحد،
سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست
سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے یا اس کے باہر۔
مجھے تو ایسا نظر آتا ہے اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں
کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی
میں بھی پیش کیا گیا تھا، لیکن اراکینِ مجلس نے انہیں اس بناء پر روک دیا
کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا
کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبے کا لحاظ کیا

جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اُس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ غالباً انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے ان کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں اور زیادہ محفوظ ہو جائیں گے اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے نہ ہی ہندوؤں کو۔ ہندوستان دُنیا کا سب سے بڑا اسلامی مُلک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس مُلک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس زندہ اور جاندار طبقہ کی مرکزیت کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبۂ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقعہ دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسدِ سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو و ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ بزورِ قوت ہو یا بزورِ خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی (۵۶) فیصدی ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ (۵۴) فیصدی ہے اور اگر عساکرِ ہند کی کُل

تعداد میں سے ان (۱۹) ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کیے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد (۶۲) فیصدی ہو جائے گی، حالانکہ اس اندازے میں وہ (۶) ہزار جنگجو شامل نہیں ہیں۔ جو بلوچستان اور صوبۂ سرحد ہی سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا باآسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ رائٹ آنریبل سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ "مسلمانوں کا مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ مل کر خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں، ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومتِ ہند پر زور ڈالا جا سکے" میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانانِ ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ اُن کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھا سکیں، لیکن ایسی مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا جسے قوم ہندو اربابِ سیاست محض اس لیے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لیے اُن کا غلبہ ہو جائے۔ بہرحال، ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی"۔

"فیڈرل ریاستوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے کہا کہ:-

"میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کے لیے کسی مستقل لسانی عقائد و معاشرت کے اختلافات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں جو زبان

نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔
سائمن کمیشن کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے اس کے ماتحت
بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام سے عمل میں نہ
آئے، بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ
کی رُو سے تقریباً ان ہی اصولوں کی بنا، پر جن کا اظہار میں نے کیا ہے صوبوں
کی بھی اَز سرِ نو تقسیم ہو جانی چاہیئے۔ میں ان دونوں تجاویز کی دل سے تائید
کرتا ہوں بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ صوبوں کی جدید تقسیم
نئے دستور کے اجراء سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیئے۔ ثانیاً اس کی
نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لیے طے ہو جائیں۔
اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بناء پر ہو گئی تو اس سے مخلوط اور
جُداگانہ انتخابات کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ میری رائے
میں اس سارے جھگڑے کی بنا صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں
کا خیال ہے کہ جُداگانہ انتخاب کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ ان کے
نزدیک لفظ "قومیت" کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام
باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملّت
کا انفرادی وجود باقی نہ رہے لیکن ہندوستان کی یہ حالت نہیں اور نہ
ہم اس کے آرزومند ہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف
مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی، ان
کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی
ناکافی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مسلمان
جُداگانہ انتخاب کے لیے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک

میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں اس امر
کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملّت کے مفاد کی پوری
پوری نمائندگی ہو سکے گی ناممکن ہے سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں
کا غلبہ ہو جائے گا لیکن اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل
میں آجائے کہ ہر صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور
ان کی نسل، ان کی زبان، ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک
ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" (۱)

ایسے کھلے ہوئے اشارے اور تصریح کے بعد بھی ——— چودھری
خلیق الزماں نے لکھا :-

اس مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک فردِ واحد نے بھی اس کا
نوٹس نہیں لیا اور نہ ہی کسی نے اپنی تقریر میں اس کی تائید میں
کوئی تجویز پیش کی اور ہوتی بھی کیسے - ؟ کیوں کہ مسلم لیگ
محض زمینداروں، تعلقہ داروں اور خطاب یافتوں کا ایک
بڑا سود مند گہوارہ تھا۔ شاید وہ جلسہ ہی اس قابل نہ تھا
کہ اس میں یہ جواہر پارے بکھر جاتے۔"

۱۹۳۰ کے اس تاریخی خطبہ میں جو آگے چل کر "قرار دادِ لاہور" کی بنیاد
ثابت ہوا نہ صرف یہ کہ بنے بنائے مکمل صوبوں کے حصول ہی سے انحراف کیا گیا تھا بلکہ
سرے سے مسلم اکثریت کے صوبے بنگال اور آسام کے شامل کرنے کا ذکر تک موجود
نہیں تھا۔ شاید اس وقت ——— ۱۹۴۰ کی کل ہند مردم شماری سے پہلے

(۱) بشکریہ کتاب " دانائے راز " مرتبہ محترم پروفیسر ضیاء الدین احمد۔ غضنفر اکیڈمی
پاکستان۔ کراچی صفحات (۱۹۸ تا ۲۰۲)

۔۔۔۔۔ وہ صوبے اپنی ایئس بیس مُسلم اکثریتی آبادی کے لحاظ سے "اکثریتی صوبے" کی تعریف میں داخل نہیں تھے!

جنوری ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۷ء کی سات سالہ مدّت ہی میں علامہ اقبال کو اس "سود مند گہوارہ" کا اندازہ ہوگیا۔ اس دوران جو خطوط اُنہوں نے جناب راغب احسن اور قائداعظم کو لکھے اس میں اس فکر تازہ کی کرنیں ہیں جو ہندوستان کے جدید حالات اور تلخ تجربات کی روشنی میں سامنے آئے، یہ اُن باتوں سے مختلف ہیں جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ الہ آباد میں سات سال قبل کہی تھیں کہ "جب تک خود مختاری حاصل نہ ہو ایک ہم آہنگ قومیت کا ہندوستان میں پیدا کرنا مشکل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انڈین سوسائٹی کی وحدتیں یورپین ملکوں کی طرح خطہ واری نہیں ہیں، خود ہندو بھی متجانس گروپ نہیں، ۔ ۔ ۔ (یا) مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انڈیا کے اندر ایک مسلم انڈیا پیدا کیا جائے حق بجانب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ (یا) میری نظر میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد اسی ہم آہنگ قومیت کے اعلیٰ نصب العین کی اُمنگوں کی حامل ہے (یا) مرکزی اسمبلی کی جگہ وفاقی ریاستوں کی اسمبلی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ خِطّوں کی اَز سرِ نو حد بندیاں اُنہیں خطوط پر کی جائیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ دونوں باتیں "سائمن کمیشن" کی رپورٹ میں بھی موجود ہیں جن کا میں دل سے حامی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ (یا) صحیح قسم کی حد بندیاں ہو جائیں تو مخلوط انتخاب اور جُداگانہ انتخاب کا جھگڑا خود بخود ختم ہو جائے گا۔ وغیرہ "

یوں لگتا ہے جیسے علامہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۴ء کے دوران "شاہ راہ پاکستان" کے تعین میں شدید کشمکش اور تذبذب کا شکار رہے۔ چنانچہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء کو جناب راغب احسن کے نام ایک خط میں مختلف افراد علماء کی نسبت اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے "پاکستان اسکیم" کی افادیت کا احساس کیا ۔۔۔۔۔۔

"جو کچھ آپ کے خیال میں ہے اس کا پورا ہونا بہت سے نئے حالات و اسباب

پر منحصر ہے۔ جن میں سب سے بڑا ضروری امر یہ ہے کہ شمالِ مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست پیدا کی جائے یا پاکستان کی اسکیم بروئے کار آئے۔[1]

وہ اہم خط جس میں اپنی ایک کتاب پر انگلستان کی نامور ادبی شخصیت ایڈورڈ تھامسن کے تبصرہ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے ۶ مارچ ۱۹۳۴ء کو چودھری رحمت علی کی "پاکستان اسکیم" سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے معروف مسلم لیگی لیڈر جناب راغب احسن (مرحوم) کو متوجہ کیا کہ :-

"....میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن، انگلستان کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ تبصرہ، مختلف وجوہ کی بناء پر، دلچسپ ہے اور شاید یہ تبصرہ آپ کے جریدہ میں اشاعت کے لیے مناسب ہی رہے۔ دوسری کاپی "اسٹار آف انڈیا" (کلکتہ) کو روانہ کر دیجیے۔ براہِ کرم نوٹ فرمائیں کہ اس تبصرے کا مصنف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز "پاکستان کی اسکیم" سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں تک میری تجویز (خطبۂ الہ آباد۔ ۱۹۳۰ء) کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے جب کہ "پاکستان اسکیم" کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال و مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہِ راست وابستہ ہو۔ آپ اپنے تعارفی کلمات میں اس نکتے کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اسٹار آف انڈیا کے مدیر کی توجہ بھی اس نکتے کی جانب کروا دیجیے گا۔"[2]

۱- (کتاب "اقبال - جہانِ دیگر" ص۵ - ص۵۱) ۲- ("اقبال - جہانِ دیگر" ص۱۱۶)

برخلاف اس کے ۱۹۳۷ء تک جو خطوط علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھے وہ اُن کے گہرے غور و خوض و فکرِ تازہ کے غماز ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ "میری نظر میں ..... مسلم صوبوں کا وفاق علیحدہ ہونا چاہیئے".... "اور مسلم صوبوں کی اِن خطوط پر حد بندیاں ہوں جو میں نے تجویز کی ہیں، یہی ایک طریقہ ہندوستان میں پُرامن ماحول قائم کرنے اور مسلمانوں کو بچانے کا ہے"......

"کیا آپ کی رائے میں ابھی اس (مطالبے) کا وقت نہیں آیا؟" —— پھر لکھا کہ "بہت سے برطانوی مدبرین بھی میری اس تجویز سے متفق ہیں مثلاً لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ صورت تو یہی ایک ہے لیکن تمہاری اسکیم کے روبہ عمل آنے میں پچیس سال کا عرصہ درکار ہو گا" —— پھر یہ لکھا کہ "شمال مغرب اور بنگال کے مسلمانوں کو دوسری قوموں (نیشنز) کی طرح انڈیا میں حق خود ارادی کی حامل قومیں کیوں نہ تصور کیا جائے جیسی انڈیا کے باہر ہیں؟" —— پھر یوں لکھا کہ "ذاتی طور پر میں سوچتا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور بنگال کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ سردست مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کریں، مسلم اکثریت کے دونوں صوبوں کے مفاد میں بہترین صورت یہی ہے، نیز بہتر ہو گا کہ آپ مسلم لیگ کا اگلا اجلاس پنجاب میں منعقد کریں، کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں نہیں ....."

ابتدائے مئی ۱۹۳۷ء میں جو خط انہوں نے قائد کو لکھا اُس میں صاف درج ہے کہ "طویل مکالمے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی نظام قانون کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اس کو نافذ کیا جائے تو کم ازکم ہر فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضمانت مل جائے گی ..... لیکن شریعتِ اسلام کا اختیار کرنا اور اس کو ترقی دینا بغیر کسی آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے اس ملک میں ممکن نہیں ہے ..... اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر لازمی ہے کہ خانہ جنگی ہو جو ہندو مسلم فسادات کی صورت

میں شروع بھی ہو چکی ہے . . . . . ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی حد بندیاں از سرِ نو اُن خطوط پر کی جائیں جو میں نے تجویز کی ہیں . . . . اور ایک یا ایک سے زیادہ ریاستیں قائم کی جائیں۔"(۱) اسی مئی ۱۹۳۷ء کی اٹھائیس تاریخ کے ایک اور خط میں دیگر باتوں کے علاوہ علامہ نے قائد کو لکھا کہ "لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا وہ صرف اُونچے طبقے کے مسلمانوں کی نمائندہ رہے گی یا مسلمان عوام کی، جنہوں نے اب تک بجا طور پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔"(۲)

دوسری گول میز کانفرنس جب ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی تو اس مرتبہ سرکارِ برطانیہ کے منانے سے کانگریس من گئی تھی اور کانگریس کیا چیز تھی یہ کہیئے کہ گاندھی جی من گئے تھے چنانچہ وہی واحد نمائندہ بن کر لندن پہنچے اور کانفرنس میں پہنچ کر اعلان فرمایا کہ "سارے برعظیم کا نمائندہ صرف میں ہوں باقی اور جو لوگ یہاں ہیں وہ کچھ بھی نہیں اور اپنی اس تقریر میں نہرو رپورٹ کا خلاصہ پیش کر کے بیٹھ گئے کہ یہی برعظیم کا مطالبہ ہے اور بس" اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے علامہ اقبال بھی تشریف لے گئے تھے۔"

اِن تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد جو پہلی گول میز کانفرنس کے وقت سے لے کر اب تک رونما ہوئے تھے۔ چودھری رحمت علی نے ضروری سمجھا کہ اپنے مسلم مندوبین کو ڈنر دیا جائے اور ڈنر تو ایک بہانہ تھا۔ وہ سب کو ایک جگہ بٹھا کے اپنی "آزاد مسلم مملکت" کے قیام کی اسکیم ان کے دلوں میں اُتار دینا چاہتے تھے چنانچہ اس ڈنر میں انہوں نے کانفرنس کی کارروائیوں پر، فیڈریشن کی "نامعقول" بحثوں پر، انگریزوں اور ہندوؤں

---

(۱) بشکریہ مضمون "چودھری رحمت علی" مصنفہ محترم محمد فرید الحق ایڈوکیٹ۔ مڈویک میگزین موقر جنگ کراچی ۲۵ فروری ۱۹۸۷ء صفحہ ۳ اور کتاب "اقبال۔ جہانِ دیگر" (مجموعہ خطوط علامہ اقبال بنام راغب احسن مرحوم صفحہ ۱۱۹-۱۱۲) مرتبہ محترم محمد فرید الحق۔

(۲) "اقبال کے خطوط جناح کے نام"

کی "چالبازیوں" پر، اور مسلم مندوبین کے "بے عملی اور بے فکرانہ" طرزِ عمل پر، جس تیز و تند لہجے میں اظہارِ خیال کیا تھا اس کی "تلخیاں" ان رسالوں، کتابچوں اور لمبے لمبے مراسلوں میں صاف نظر آتی ہیں جو کانفرنس کے دوران بھی اور اس کے فوراً بعد بھی ان کے قلم سے نکلتے رہے تھے اور برِعظیم میں اور خود لندن میں، پارلیمنٹ کے اراکین سمیت، ہر ذمہ دار شخص کے پاس پہنچتے رہے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "مسلم مندوبین نے ناقابلِ معافی غلطی کی ہے۔ یہ مسلم قوم کے حق میں شرمناک بے انصافی ہے..... کہ بغیر کسی احتجاج کے، بغیر کسی جھجک کے اور بغیر کسی بحث و استدلال کے آل انڈیا فیڈریشن کی بنیاد پر بنائے جانے والے آئین کو قبول کر لیا جائے۔ ... انڈیا ملک ہرگز نہیں ہے یہ ایک برِعظیم ہے، یہ کسی ایک نیشن کا وطن نہیں ہے، تاریخ میں پہلی مرتبہ انگریزوں نے اس کو مختلف خطوں اور علاقوں کو ملا کر ان پر اپنی ایک حکومت مسلط کی ہے ....

ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب، ہماری روایات، ہمارا سماجی اور معاشی نظام، ہمارا قانون وراثت اور شادی بیاہ کے اصول، تمام چیزیں برِعظیم کی دوسری قوموں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں..... ہماری غذا اور لباس تک ایک نہیں ہیں..... روس کو یورپ سے الگ کر کے دیکھئے یورپ رقبے میں اور آبادی میں ہمارے اس برِعظیم کے برابر ہے اور اس یورپ میں کتنی قومیں (نیشنز) آباد ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسی طرح یہاں ہندو اور مسلمان قومیں (نیشنز) علیحدہ علیحدہ رہیں؟ اور ان کے ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوں اور دونوں اپنی اپنی ترقی کے لیے اپنے اپنے پسندیدہ راستوں پر آگے بڑھیں؟..... نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے رہنماؤں کو اظہارِ حق کی جرأت نہیں ہوتی..... آخر کیوں نہیں ہوتی.....؟

اس ڈنر میں علامہ اقبال بھی موجود تھے قائدِاعظم بھی اور دوسرے مسلم مندوبین کے علاوہ خود چوہدری رحمت علی کے وہ رفقا بھی جو اس موقع پر دیوانوں کی طرح کام

کر رہے تھے۔ چودھری رحمت علی بڑے پیچ و تاب کے عالم میں تھے۔ ان کی قومی و ملی عزت و وقار ہی کو نہیں زندگی کو خطرہ درپیش تھا تاہم انہوں نے نسبتاً صبر و تحمل سے کام لیا۔

گول میز کانفرنس کا دوسرا دَور بھی ختم ہوا۔ تیسرا دور جو ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء سے شروع ہوا وہ بھی ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہو گیا۔ کانگریس نے اس آخری دور میں بھی شرکت نہ کی بلکہ گاندھی جی کی ہدایت پر اس نے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور اپنے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئی جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ کو دوسری باتوں میں اُلجھا دیا جائے، وہ اصل مسئلہ پر غور و فکر کا کوئی موقع دل جمی کے ساتھ نہ پائیں نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں شدید اختلاف و انتشار پھیلا۔ یہ بھی ان ضروری کاموں میں سے ایک تھا۔ اِدھر انگریز اپنے نقشے کے مطابق اپنی سیاسی اور قانونی کارروائیوں کی ترتیب میں منہمک ہو گئے۔ گول میز کانفرنس کا یہ سیاسی ڈرامہ ختم ہو گیا اور اس کے تمام مندوبین اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے، مگر کسی گوشے سے بھی کوئی آواز ایسی بلند نہ ہوئی جو چودھری رحمت علی کے لیے ہمت افزا ثابت ہوتی۔

سب سے زیادہ توقعات چودھری رحمت علی کو جن رہنماؤں سے اپنی اسکیم کے بارے میں تھیں۔ ان میں سے ایک تو مولانا محمد علی تھے مگر وہ پہلی ہی گول میز کانفرنس کے دوران ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو راہی ملک عدم ہو گئے۔ دوسرے علامہ اقبال تھے جو دوسری گول میز کانفرنس کے لیے پہنچے تھے بھی تو کچھ ہی دنوں بعد موتمر کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے بیت المقدس روانہ ہو گئے۔ تیسرے قائداعظم تھے، اور "آزادی و اختیارات و تحفظات" اِن کا موضوع خاص تھا۔ انہوں نے کانفرنس کی "مجلس وفاق" میں یہ اعتراضات تو ضرور کیے کہ "برطانوی ہند میں وفاق قائم ہو گا تو کس قسم کا ہو گا؟ کہا گیا ہے کہ صوبوں کو خود مختار ریاستوں کی سی حیثیت حاصل ہو گی اگر یہ خیال درست ہے تو

اس صورت میں صوبوں کی شرکت وفاق میں ویسی ہو جائے گی جیسی ہندوستانی ریاستوں کی ہو گی۔ تو کیا "ایک وفاق" ہو گا؟ یا دو وفاق ہوں گے؟ یا وفاق در وفاق متعدد ہوں گے؟ یہ بات اب تک واضح نہیں ہے، پھر اس کی بھی وضاحت ہونی چاہیئے کہ ہندوستانی ریاستیں وفاق میں کس بنیاد پر شریک ہوں گی؟ اور اگر وہ شامل ہو گئیں تو کیا وفاق کی صورت بھی باقی رہے گی؟ اس وفاق کے لیے تو ضروری ہو گا کہ صوبوں کو پہلے خود مختار ریاستوں کے طور پر تسلیم کیا جائے"۔ . . . مگر بعد کے اجلاس میں وہ شریک نہ ہوئے۔

دوسرے ذہین مسلم سیاستدان میاں فضل حسین اور مولوی فضل الحق وغیرہ جو مختلف صوبوں میں تھے یا مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان جیسے حوصلہ مند جو اپنی بات بے دریغ کہہ کے میدان میں کود پڑنے کے عادی تھے وہ سب ہندوستان میں تھے لندن میں کوئی موجود نہ تھا کہیں سے کوئی آواز سنائی دیتی۔ چوھدری رحمت علی کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ بس ایک قائداعظم ہی ان کے سامنے تھے جو برعظیم کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن ہی میں مقیم ہو گئے تھے اور جن کی رائے نہرو رپورٹ کی کشاکش کے بعد ۱۹۲۹ء ہی سے یہ تھی کہ "انگریزی حکومت نے دھاندلی اور چالبازی کو، ہندو لیڈروں نے تنگ نظری وعیاری کو اور کچھ مسلمان لیڈروں نے عاقبت نا اندیشی و تفرقہ انگیزی و گروہ بندی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ اور یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کو کسی طرح متحد و منظم نہ ہونے دیا جائے"۔ قائداعظم لندن میں تھے اور چوھدری رحمت علی کی رسائی کی حد میں بھی۔ بالمشافہ گفتگو انہیں سے ہو سکتی تھی، اور ہوتی تھی، وہ انہیں سے لڑتے جھگڑتے اور اپنے دل کا بخار نکالتے اور پھر پلٹ کے اپنے ہم خیال نوجوانوں کو ساتھ لے کر یا اکیلے ہی مراسلے لکھنے، پمفلٹ تیار کرنے اور اپنے ملک کے مسلم رہنماؤں کو، برعظیم میں اپنے دوستوں کو نیز برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کو بھیجنے میں مشغول ہو جاتے تھے۔

آخر جنوری ۱۹۳۳ء میں چوھدری رحمت علی نے اللہ کا نام لے کر ایک فیصلہ کر لیا۔ اپنا وہ انقلاب انگیز و طوفان خیز رسالہ بڑے اہتمام سے مرتب کیا جس کا نام تھا NOW OR NEVER جس کو دوسرے لفظوں میں "انتباہ آخریں" کہنا چاہیئے کہ اللہ کے واسطے اٹھو، اقدام کرو، اگر رمق حیات باقی ہے تو آگے بڑھو کہ یہی وقت اقدام کا ہے، یہ وقت اگر نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ اور یہ رسالہ بھی انہوں نے حسب معمول سب کو بھیجا اور یہی رسالہ ہے جس کے ذریعے انہوں نے اپنی اسکیم اور اس کی جدوجہد کو "پاکستان نیشنل موومنٹ" کا نام دے کر اس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ یہ نہایت ہی صبر آزما لیکن جرأت مندانہ اقدام تھا اور چوھدری رحمت علی نے یہ اقدام کیا۔

یقین ہے کہ اس اہم رسالے کو اور تحریک کے اعلان کو وہ خود لے کر قائداعظم کے پاس پہنچے ہوں گے۔ دل جیسے چوھدری رحمت علی کا زخمی تھا ویسے ہی قائداعظم کا بھی زخمی تھا۔ مگر اب نہ چوھدری ہی باقی ہیں نہ قائداعظم موجود ہیں اور نہ کہیں کوئی اور دکھائی دیتا ہے جو بتائے کہ ان دونوں میں کیا گفتگو ہوئی۔ سب ہی جانتے ہیں کہ قائداعظم بڑی عمر کے لوگوں سے اور لیڈروں سے ملتے وقت جتنے خشک نظر آتے ہیں اتنے خشک نوجوانوں سے ملنے میں نہیں تھے بلکہ ان جوانوں سے جو صاحب علم بھی ہوں۔ ذہین و فطین بھی ہوں، دل میں قومی جذبہ بھی رکھتے ہوں اور ملک و ملت کے لیے کام کرنے پر کمربستہ بھی ہوں تو ان سے وہ بہت گھل مل جاتے تھے، بے تکلف ہو جاتے تھے اور چوھدری رحمت علی کو بھی معلوم تھا کہ دُکھتی رگ کسے کہتے ہیں، انہوں نے ضرور کہا ہو گا کہ آپ نے اتنی محنت و مشقت کی، اتنی دوڑ دھوپ کی۔ آخر آپ کو یہی کہنا پڑا کہ "اب راہیں جُدا ہیں" تو پھر وہ راہ اور کون سی ہے جو آپ اپنی قوم کو دکھائیں گے؟ کیا یہی نیشنلزم کی راہ ہے؟ یہ تو انہیں لوگوں کی راہ ہے جن سے آپ کی راہ جُدا ہے۔ میری نظر میں تو صرف ایک ہی راستہ ہے اور یقیناً وہی راستہ آپ کا ہے۔ جو وفاق

کا نہیں۔ متحدہ برٹش انڈیا کا نہیں، متحدہ برعظیم کا بھی نہیں۔ بلکہ شمال مغربی خطے میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کا راستہ ..... جہاں ایک پنجاب ہی نہیں، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبے قائم کرنے کی جدوجہد آپ نے کی اور قائم بھی کروالیا اور یہ اسی کی تحریک ہے، جو میں نے شروع کردی اور یہ ابھی کا رسالہ اور اعلان ہے" دیکھئے اس میں پنجاب، افغانیہ، کشمیر، سندھ اور بلوچستان، اور اُن کے ساتھ کچھ کاٹھیاواڑ سمیت چند اور بھی چھوٹے چھوٹے علاقے شامل ہوں گے۔ یہ اس کا تفصیلی نقشہ ہے .... کچھ نہیں معلوم کہ ان دونوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں، قائداعظم نے ان کی اسکیم کو مسترد کیا تو کیا کہہ کے مسترد کیا اور پسند کیا تو کیا کہہ کے پسند کیا اور کیا مشورے ان کو دیئے۔ مشورے انہوں نے ضرور دیئے ہوں گے مگر کچھ معلوم نہیں۔ ہاں اگر ہم ذرا ڈوب کے دیکھیں اور بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑیں تو نظر آئے گا کہ دونوں کی راہ ایک سی تھی۔ مشکل صرف یہ ہے کہ قائداعظم بڑے گہرے سیاست داں تھے اور اپنی بات ظاہر کرنے کے قائل نہ تھے حتیٰ کہ اگر وہی خیال آپ پیش کرتے جو خود ان کے دل میں ہوتا۔ جب بھی وہ ایسی گفتگو کرتے تھے اور ایسے شبہات واعتراضات کا انداز اختیار کرتے تھے کہ ان کے دل کی بات کبھی آپ کے سامنے نہ آتی تھی۔ برعظیم کی بساطِ سیاست پر اکثر شاطروں کو اُن کی چالوں سے بڑی غلط فہمی ہوئی۔ غیر تو پھر غیر تھے، خود مسلمانوں کے اجتماعات میں بھی بلکہ مسلم لیگ کے اندر بھی بارہا لوگوں نے یہ سمجھا کہ قائداعظم کا رُخ "اِدھر" ہے مگر بعد میں یہ معلوم ہوا کہ نہیں "اُدھر" تھا۔ گول میز کانفرنس کے موقع پر اور تو اور، برطانیہ تک کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ فیڈریشن کے علمبردار ہیں، مگر یہ بعد میں کُھلا کہ وہ فقط اپنے مقصود کے حامی تھے، اس قسم کے متفرق اجزاء کو جو صرف یہی دو چار نہیں بلکہ اور بھی بہت ہیں، اگر جمع کریں تو قائداعظم کے بارے میں بھی رائے قائم کی جائے گی کہ گول میز کانفرنس کے زمانے میں ان کا ذہن اندر ہی

اندر اسی رُخ پر کام کر رہا تھا جس رُخ پر رحمت علی کا قلم بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ تفصیلات میں ممکن ہے فرق ہو جو بالکل فطری ہے۔ اسی لیے خیال ہے کہ جب چوھدری رحمت علی نے اپنی تحریک کا اعلان کیا یا مسودہ یا پمفلٹ اُن کے سامنے رکھا ہوگا اور باتیں کی ہوں گی تو وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے کیونکہ جہاں تک کے بھی تجزیئے کا تعلق ہے یہ اسکیم خود ان کے اپنے رجحان کے مطابق تھی۔

چوھدری رحمت علی نے جب یہ تحریک جنوری ۱۹۳۳ء میں باقاعدہ شروع کی تو اس سے پہلے ہی سے ان کے دوستوں اور ہم خیالوں کا ایک خاموش حلقہ، مختصر ہی سہی، جا بجا موجود تھا۔ تحریک کے شروع ہوتے ہی وہ سب متحرک ہو گئے، جو شخص جہاں تھا وہیں اپنے اپنے انداز سے اس کو پھیلانے لگا۔ لندن میں بھی چوھدری رحمت علی نے رسالے اور پمفلٹ کے علاوہ پارلیمنٹری سیلکٹ کمیٹی کے اراکین کے نام خطوط اس قدر اور اس تسلسل سے روانہ کیے کہ ان کی "یلغار" نے بہتوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یہ اسی کی گونج تھی جو اگست ۱۹۳۳ء کی جوائنٹ پارلیمینٹری کمیٹی کے اجلاس میں سُنائی دی اور اس کے سوال و جواب کی صورت میں اس طرح محفوظ ہو گئی۔

سر ریجنالڈ کریڈک: کیا مندوبین میں یا شاہدین میں کوئی صاحب مجھے بتائیں گے کہ پاکستان کے نام سے بھی صوبوں کے وفاق کی کوئی اسکیم موجود ہے؟

عبداللہ یوسف علی: جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ ایک طالب علم کی اسکیم ہے کسی ذمہ دار شخص نے پیش نہیں کی۔

سر ریجنالڈ کریڈک: اب تک تو نہیں پیش کی، لیکن آپ لوگ کہتے ہیں کہ انڈیا میں قدم بڑی تیزی سے بڑھائے جاتے ہیں، تو ہو سکتا ہے کہ جب وہ طالب علم اپنی عمر کو پہنچیں تو یہ اسکیم لوگوں کے ذہنوں میں تو ضرور ہو گی؟

سر محمد ظفر اللہ خان : آخر سوال کیا ہے ؟

سر ریجنالڈ کریڈک : میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شاہدین میں کوئی صاحب اس اسکیم کا علم رکھتے ہیں جو پاکستان کے نام سے ہے ؟

سر محمد ظفر اللہ خان : اس کا جواب دیا جا چکا کہ یہ ایک طالب علم کی اسکیم ہے اور اس میں کوئی بات نہیں ہے، مزید سوال کیا ہے ؟

آئزک فوٹ : پاکستان کیا ہے ؟

سر محمد ظفر اللہ خان : جہاں تک ہم نے اس پر غور کیا ہے یہ محض خیال آرائی ہے، فضول ہے اور ناقابل عمل۔ اس کا مطلب چند صوبوں کا وفاق ہے۔

سر ریجنالڈ کریڈک : مجھے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں پاکستان کے نام سے مسلم ریاستوں کی تشکیل کی تجویز درج ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین : شاید یہ کہنا کافی ہو گا کہ ایسی کوئی اسکیم ابھی تک کسی نمائندہ شخص یا تنظیم کے زیر غور نہیں آئی اور ایک شریک اجلاس نے فتویٰ دیا کہ " وہ ایک نام و نمود کی محفل ہے "۔

" نام و نمود " کی یہ اسکیم اگر اتنی ہی " لچر اور فضول " ہوتی تو کمیٹی میں اتنی بحث اس پر نہ ہوتی، نہ اتنا وقت اس پر ضائع کیا جاتا۔ سر ریجنالڈ کریڈک وہ شخص تھا جس کی اپنی تصنیف " چیستان ہند " (THE DILEMMA OF INDIA) اسی ہندو مسلم مسئلے کی پیچیدگیوں سے تعلق رکھتی اور ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ ہمارے یہاں کے لوگوں میں بے فکری، بے خبری یا سہل انگاری عام ہو تو ہو، اس کتاب کا مصنف ذمہ دار بھی تھا، باخبر بھی تھا اور مستعد بھی، اُسے خوب معلوم تھا کہ ہندو لیڈروں کی سیاست کا رُخ کیا ہے اور مسلمانوں کے دور اندیش و ذہین رہنما بساط سیاست پر اپنے مہرے کس انداز سے بڑھا رہے ہیں۔ سر ریجنالڈ کریڈک نے " پاکستان اسکیم " کے بارے

میں جو بار بار سوالات کیئے اس کا اصل سبب یہ تھا کہ خود اسکیم اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتی تھی برطانیہ کی بین الاقوامی سیاست اور ہندوؤں کے عزائم کے اعتبار سے یہ اسکیم ناپسندیدہ ہو تو ہو، اس کو "ناقابلِ عمل" کہنا یا سمجھنا درست نہیں تھا۔ وہ صرف یہی جاننا نہیں چاہتا تھا کہ یہ اسکیم کس کی ہے؟ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جو کچھ اس اسکیم میں ہے ویسی کوئی بات مسلم رہنماؤں کے ذہنوں میں بھی موجود ہے یا نہیں؟ سر کریڈک کے حافظے میں کم از کم پچیس سال کی ایک ایک بات محفوظ تھی مگر جن لوگوں نے مسلمانوں کی طرف سے کمیٹی میں جوابات دیئے اُن کے حافظے میں کچھ نہ تھا۔ نہ انہوں نے خود کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کی۔ یا پھر وہ اپنے دائرے سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے علامہ اقبال کا صرف وہ بیان تھا جو لندن ٹائمز میں چھپا تھا دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے جب علامہ لندن پہنچے تھے تو اخبار ٹائمز کے نمائندوں نے اُن کو گھیر لیا تھا اور طرح طرح کے سوالات ان سے کیئے تھے۔ یہ پوچھا تھا کہ "آپ نے اپنے خطبہ صدارت الہ آباد میں "مسلم ریاست" کا فقرہ کن معنوں میں استعمال کیا ہے" اور "سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر" کا فقرہ جو فرمایا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ " اور علامہ نے جواب میں اِن کو یہ سمجھایا تھا کہ "میں نے "مطالبہ" نہیں کیا ہے کہ برطانوی سلطنت کے باہر کوئی مسلم ریاست قائم کی جائے۔ بلکہ یہ "محض ایک گمان" ہے کہ برعظیم کی منزل آخریں کے تعین میں جو زبردست قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں ان کا نتیجہ "مستقبل بعید" میں شاید ایسا ہی ہو۔" اس کے علاوہ مسلم کانفرنس لاہور منعقدہ ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں علامہ نے جو مزید یہ فرمایا تھا کہ "اندرونی تضادات کے باوجود ہندوستان کی وحدت اور مربوط سالمیت کی تشکیل پر میرا ایمان ہے، قدیم ہندوستان کا عقیدہ "کثرت میں وحدت" کا رہا ہے، آج ہمیں اس کو "وحدت میں کثرت" کا روپ دینا ہے"...... ان حضرات نے انہیں باتوں

کو اپنے سامنے رکھا مگر شاید ان " اصطلاحات " کے مفہوم کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ جوائنٹ کمیٹی میں جس قسم کے فقرے اور جملے، بہ انداز تحقیر، چوہدری رحمت علی یا پاکستان نیشنل موومنٹ کے بارے میں استعمال کیے گئے، ان سے چوہدری رحمت علی کے دل کو تو بہت دکھ پہنچا ہو گا لیکن اُن کا حوصلہ پست نہیں ہوا بلکہ شاید اور بڑھ گیا۔ اِن کی تحریک کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ (۱)

بعض اوقات دُنیا کی عظیم ایجادات و واقعات بھی ایک ذرا سی غلطی سے ظہور میں آجایا کرتے ہیں۔ ایک ایسی غلطی جو پوری احتیاط و دانش مندی کے باوجود عمل میں آیا کرتی ہے۔ خواہ ایسی غلطی کسی فوری نتیجے پر منتج ہو کر ربڑ اور پنسلین کے حصول کا سبب بنی ہو یا ایک منٹ کی تاخیر سے نپولین کو واٹرلو کا نقشِ عبرت بنا جاتی ہو۔ جاپان کی یہ غلطی تھی کہ اُس نے روس کی پشت کے بجائے پرل ھاربر پر حملہ کیا۔ چرچل کی یہ غلطی تھی کہ اُس نے میبل کے بجائے نارمنڈی پر دوسرا محاذ کھولا۔ روزولٹ کی یہ غلطی تھی کہ اُس نے جرمنی کی غیر مشروط اطاعت پر اصرار کیا۔ شاید تاریخ گاندھی اور اقبال سے بھی ایسی ہی غلطی سرزد کرا کے تاریخ ھند کو ایک نیا موڑ دینا چاہتی تھی۔ اقبال نے یہ غلطی کی کہ اُنھوں نے برطانوی ھند کے پورے علاقائی وسعت پر مشتمل مسلم یا لسانی صوبہ جات کے مطالبہ کے بجائے صوبہ جات کے انقطاع شدہ صرف اُن مسلم اکثریتی اضلاع و ڈویژنز پر مشتمل ایسے " پاکستان " کا مطالبہ کیا جو قرارداد الٰہ آباد کی بنیاد تھا اور جس کی بنا پر سفارش کی گئی تھی کہ علاقہ جات کو نو تشکیل صوبائی حد بندیوں میں اس طور پر متحد کیا جائے کہ مسلم اکثریت واضح طور پر ان میں سمٹ آئے اور گاندھی کی یہ غلطی تھی اُس نے " دو قومی نظریہ " کو تسلیم کر لیا جس کی آخر وقت تک اُس نے

---

(۱) بشکریہ محترم فرید الحق صاحب مضمون " چودھری رحمت علی " د مڈ ویک میگزین " (جنگ کراچی) ماہ فروری ۱۹۸۷ء - ص۹)

بھرپور مخالفت کی تھی ــــــــ (۱)

"دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے مصداق یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ دل برداشتہ قائد لندن میں بیٹھے کچھ اسی قسم کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ علامہ اقبال کی تجویز اور بعد کے خطوط قائد کو اپیل کر گئے اور پوری سنجیدگی سے انھوں نے اس منصوبے کو اپنا لیا۔ چنانچہ علامہ اقبال کے انگریزی مجموعۂ مکتوبات ــــــــ "اقبال کے خطوط جناح کے نام" کا دیباچہ لکھتے ہوئے قائد نے اعتراف کیا کہ :-

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ خطوط زبردست تاریخی اہمیت کے حامل ہیں؛ بالخصوص وہ جن میں مسلم انڈیا کے سیاسی مستقبل کے متعلق اُن کے نظریات کی صاف اور غیر مبہم انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ اِن کے نظریات میرے اپنے نظریات سے اچھی خاصی مماثلت رکھتے ہیں جن کے ذریعہ میں نے بھی وہی نتائج اخذ کیے ہیں جو ہندوستان کو درپیش آئینی مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنے پر میرے سامنے آئے جو بالآخر مسلم انڈیا کا متحدہ منشاء بن کر آل انڈیا مسلم لیگ کی لاہور والی قرارداد جسے عام طور پر "قراردادِ پاکستان" کہا جاتا ہے۔

---

(۱) مسٹر ولی خان کے اس اخباری انٹرویو کے جواب میں جسے اخبار جنگ کراچی نے "چٹان" لاہور سے لیکر ۲۲ دسمبر ۱۹۸۱ء کو شائع کیا کہ "قراردادِ پاکستان سر ظفر اللہ خان نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو تیار کی تھی"۔ مجلس شوریٰ اسلام آباد میں ۱۷ جنوری ۱۹۸۲ء کو تقریر کرتے ہوئے وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ نے بیان دیا کہ "سر ظفر اللہ خان نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی جب کہ "قراردادِ پاکستان" خود قائد اعظم نے تیار کی تھی -"!

(روزنامہ جنگ، کراچی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۸۲ء)

جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی تھی کی صورت میں نمودار ہوا۔ (۱)

۱۹۳۵ میں لندن سے واپسی کے بعد جب جناح نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو انہوں نے اپنے لیے ایک واضح اور صاف پالیسی اختیار کر لی جس پر وہ آخر وقت تک پوری مضبوطی سے قائم رہے کہ "سو سب کی"۔ مگر کروں گی جواپنی مجھ لوجہ لگے "اس پالیسی پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کرتے ہوئے ہر "دارے جاؤں صدقے جاؤں" ہر سے کو اپنی جگہ اس طور پر فٹ کیا کہ کوئی بھی "بیر م خان" کے روپ میں "اتالیقی" کے خواب نہ دیکھ سکے۔ وہ اتالیقی جس سے جناح کو چڑ تھی اور جس نے ماضی میں انہیں بڑے تلخ درس دیئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف نواب زادہ لیاقت علی خان۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ نواب بہادر یار جنگ۔ سردار عبدالرب نشتر۔ سر سکندر حیات اور اے۔ کے فضل الحق وغیرہ کو پسند کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے فیصل کیے ہوئے فیصلوں پر ان میں سے کسی کو اثر انداز ہونے کی کبھی اجازت نہیں دی تو دوسری طرف چودھری خلیق الزماں، عبدالرحمن صدیقی اور نواب اسماعیل خان کو مسلم لیگ کی ڈرافٹنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ کوئی شک نہیں کہ ان کے ڈرافٹ کیے ہوئے مسودے اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعض اپنے اور بعض پرائے انہیں "ضدی" سمجھنے لگے تھے حالانکہ ضد اور "عزم" میں قدرے ہی مماثلت ہونے کے باوجود وہ "ضدی" نہیں تھے۔ وہ صلح کل تھے لیکن گر کر صلح کرنا اُن کا مسلک نہ تھا۔ حالات ہی کچھ اس کے متقاضی تھے کہ انگریز اور کانگریس کی مشترک مکارانہ چالوں کے سامنے ایسا ہی رویہ اختیار کیا جائے جب کہ از اول تا آخر سب ہی "کھوٹے سکے" ہوں۔ چنانچہ لیگ کے سیکرٹری جنرل

---

(۱) علامہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے نصب العین کا تعین اپنے خطوط میں واضح طور پر کر دیا تھا قائد اعظم نے ۱۹۴۲ء میں علامہ اقبال کے تیرہ خطوط پر مبنی ایک کتابچہ شائع کیا تھا جو ان کے نام ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے۔
(موقر روزنامہ جنگ۔ کراچی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی نسبت قائداعظم کی رائے کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی زبانی ریکارڈ کرتے ہوئے ملک کے مایہ ناز ادیب مختار مسعود نے اپنی کتاب "آوازِ دوست" میں لکھا کہ :۔

"مس جناح نے بتایا کہ قائداعظم نے لیاقت علی خان کی سوجھ بوجھ پر لیاقت، ڈیسائی پیکٹ[1] کے بعد کبھی بھروسہ نہ کیا اور اگر وقت اور واقعات کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی تو وہ ضرور کسی اور شخص کو اُن کی جگہ دے دیتے۔ محترمہ نے یہ بھی کہا کہ ہیکٹر بولیتھو کو قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ لیاقت علی خان کے کام کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے۔ جب ہیکٹر بولائیتھو کی کتاب اس گفتگو کے چار سال بعد چھپ کر آئی تو میں نے اس کی ایک جلد خاص طور پر کراچی سے منگائی اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مس جناح کے خدشات بالکل درست تھے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ بڑی حد تک جولائی ۱۹۴۳ء میں اُس روز ہو گیا تھا جب لیاقت علی خان ہیمسٹڈ گئے تھے۔ تاکہ جلا وطن جناح سے گفتگو کریں۔ یہی نہیں، بلکہ کتاب میں بیگم لیاقت علی خان کے ذکر کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ قائداعظم اپنے خط میں لیاقت علی خان کو لکھا کرتے تھے کہ ـــــــ

---

(۱) مشہور کانگریسی لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی پر جناح ماؤنٹ بیٹن نے رائے ظاہر کی تھی کہ :۔ اگر جناح "دیوانہ" کی بجائے ان سے معاملہ ہوتا تو ناممکن ہے ۔ ملک کو تقسیم کیے بغیر کوئی معقول سمجھوتہ ہو سکتا " (فریڈم ایٹ مڈ نائٹ) جنگ۔ ۶ اپریل ۱۹۸۲ء

"میرا دل تم دونوں کے ساتھ ہے"۔ لطف تو یہ ہے کہ
اس کتاب کے پانچویں باب میں بیگم لیاقت علی خان کی
زبانی، اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا گیا ہے کہ اگر قائداعظم
کو حالات فرصت دیتے تو لیاقت علی خان کو علیحدہ کر
دیتے۔ بیگم لیاقت اس مفروضہ کو مہمل قرار دیتی ہیں۔
ممکن ہے یہ سچ ہو مگر مجھے بولائیتھو کی ساری کتاب
ہی مہمل معلوم ہونے لگی ہے"۔ (۱)

اور بقول ملک کے مایہ ناز فرزند "زیڈ" اے۔ سلیری:۔

"اب اس ضیاع کی تلخ داستان بھی سن لیجئے۔ پہلے
وزیراعظم کے زمانے میں، ایک انگریز، ہیکٹر بولیتھو
کو قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کا کام سونپا گیا۔ یہ شخص
برطانوی شاہی خاندان کا پالتو محرر تھا۔ وہ ان کے چھوٹے
بڑوں کے قصے کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ وہ موضوع سیاست
سے قطعی نابلد تھا۔ چہ جائیکہ برصغیر کے گھمبیر اور گنجلک معاملات
کو سمجھے جو اس کی تقسیم کا موجب بنے۔ ایسے مصنف سے
قائد کی سوانح لکھوانے کی کیا تُک تھی؟ بولیتھو کو ریکروٹ
کرنے کا ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے خداوندگانِ
قضا و قدر جن خطوط پر چاہتے سوانح لکھوا سکتے تھے۔ چنانچہ
جو کتاب اس کے قلم سے نکلی وہ نہایت ہلکی تھی۔ اس میں
قائداعظم کی تاریخ ورپاکستان ساز شخصیت نہ جھلکتی تھی۔

---

(۱) بولیتھو کو اس کارگزاری: کتاب کا معاوضہ دو لاکھ ۳۴ ہزار روپیہ ادا کیا گیا۔ ہیکٹر بولائیتھو "ہارڈ مین" کا مصنف اور "اسٹیٹسمین" کا سابق ایڈیٹر بھی تھا۔ (محرمانِ قائداعظم، مصنفہ منشی عبدالرحمن خان۔ ص ۲۰۵

بین الاقوامی طور پر قائداعظم کا درجہ گھٹانے میں "سرکاری"
کتاب کا بہت کچھ ہاتھ ہے۔ اس نقصان کی تلافی کرنے
کی پھر کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ ہماری حکومتوں کا طرزِ عمل
ناخلف اولاد کا سا رہا ہے جو اپنے باپ دادا کی کمائی سے
گلچھرے تو خوب اڑاتے ہیں لیکن ان کے حق میں دعائے
خیر کے بھی روادار نہیں ہوتے۔" (۱)

اور جو سلیری صاحب کی بات مان لی جائے تو پھر ہیکٹر بولائیتھو کتاب کے
مترجم صدیقی صاحب کے اس دیباچے کا کیا بنے گا۔ جس میں انھوں نے "نیرنگیٔ زمانہ"
کے حوالے سے لکھا کہ:۔

"اس بات کا افسوس ہے کہ بولائیتھو نے اس تصنیف کا کام اس
وقت شروع کیا۔ جب قائداعظم کے اکثر ہم عصر، دوست
اور رفیقِ کار، جن میں نواب زادہ لیاقت علی خان اور
مسز سروجنی نائیڈو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رحلت
کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ مصنف کو قائداعظم کے
وہ کاغذات، یادداشتیں اور نوٹ بک بھی نہ مل سکے
جو محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں تھے۔ اگر یہ دقتیں انھیں
پیش نہ آتیں تو ان کی تصنیف کہیں زیادہ جامع، مفید اور
دلچسپ ہوتی۔ کتاب ۱۹۵۲-۱۹۵۴ میں حکومتِ پاکستان
کے تعاون سے لکھی گئی اور نومبر ۱۹۵۴ میں چھپی۔" (۲)

---

(۱) "مسائل دانشکار"۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۶ اپریل ۱۹۸۳ء

(۲) صفحہ (۱۱) دیباچہ کتاب مذکور۔ ترجمہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ "رحلت کر چکے تھے" کے بعد وہ کون دوسرے "خداوندگان تضاد و قدر" تھے۔ جنھوں نے ۵۲ تا ۵۴ کے دوران نہ صرف اس "ریکروٹ" سے تعاون کیا بلکہ اس "مہمل" اور "ہلکی" کتاب کے مسودہ جات کو منضبط کرنے کے بجائے معاوضتہً دو لاکھ (۴۲) ہزار روپے ادا کر کے قائد کے امیج کو گھٹانے میں "رحلت کر چکے تھے" سے تعاون کیا۔؟

بہرحال بحیثیت مجموعی فضل الحق سے لیکر جی ایم سید تک اراکین لیگ و ممبران مجلسِ عاملہ کی نسبت تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے۔ "شاہ راہِ پاکستان" کے مصنف و مسلم لیگ کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے ممبر چودھری خلیق الزماں نے لکھا کہ :-

> "ایک بڑی مصیبت لیگ کی یہ تھی کہ اس کے اکثر نمائندے کل ہند سیاست سے بالکل بے بہرہ اور ناواقف تھے جن کو اپنی زندگی میں سوائے صوبائی معاملات کے ہندوستان کے بڑے سیاسی مسائل کا کوئی جیتا جاگتا تجربہ نہ تھا۔ نہ انہوں نے انگریزوں سے ٹکر لی تھی۔ نہ کبھی کانگریسی سیاست کو سمجھنے کی کوششیں کی تھی۔ جناح صاحب کی لیڈری کو وہ اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کا کفارہ سمجھتے تھے۔ جس سے وہ اپنے آپ کو کم اور جناح صاحب کو زیادہ نقصان پہنچا رہے تھے۔
> کچھ عرصے سے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے جلسے محض "یس سر" "جی حضور" پر ختم ہو جاتے تھے۔ ان جلسوں میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ بھی کسی چیز پر بحث و تمحیص نہ ہوتی تھی۔ کسی زندہ جماعت کے لیے یہ رجحان بڑا خطرناک تھا۔"

اور خود چودھری صاحب کی نسبت مشہور مسلم لیگی لیڈر راجا صاحب محمود آباد کی

رائے درج کرتے ہوئے مختار مسعود نے لکھا کہ :-

"ہم لوگ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے بارے میں رازداری کا حلف اُٹھا کر شامل ہوتے تھے اور جوں ہی باہر آتے اُسی وقت ایک شہرت پسند ممبر صحافیوں کی معرفت، سارے راز ہندوؤں تک پہنچا دیتے تھے۔ اس سستی شہرت کے طالب کا ظرف چھوٹا اور زبان دراز تھی" مختار مسعود نے لکھا۔ "راجا صاحب کی زبان سے یہ بات عجیب لگی نہ جانے اُن کا روئے سخن کدھر تھا۔ سُننے والوں کو شبہ ہوا کہ اِن کا اشارہ یا تو اِن صاحب کی طرف ہے جو بڑے خلیق ہیں اور زمانہ انھیں اسی حیثیت سے جانتا ہے یا ——— اِن بیگم صاحبہ کی طرف جنہیں ان دنوں بڑا اعزاز حاصل تھا۔"

مسلم لیگ کی انتشاری کیفیت اور گروہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے "آزادی کی کہانی میری زبانی" میں سردار عبدالرب نشتر نے کہا کہ :-

"قائدِ اعظم کی زندگی میں ہی مسلم لیگ میں گروہ بندی شروع ہو گئی تھی۔ اس گروہ بندی پر انھوں نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔"

اور آخر میں، خود قائدِ اعظم نے اپنے اِن تمام "رفقاءِ اکابرین" کو جن شاندار الفاظ میں "خراجِ تحسین" پیش کیا ہے اُس کا ذکر کرتے ہوئے سردار نشتر نے لکھا :-

"ایک دن، انھوں نے مجھ سے مسلم لیگ کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ہاتھ

میں کھوٹے سکے ہیں (۱)"۔ اس قسم کے الفاظ انھوں
نے زیرِ بحث حال میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس کے دوران
کہے تھے۔" (۲)

ایسے ہی حالات ہوں گے کہ قائد کی "سخت طبیعت" کی نسبت بنگال کے
گورنر آر۔ جی۔ کیسی نے اپنی کتاب AN ASTRALIAN IN INDIA
میں رائے ظاہر کی:۔

"وہ غیر معمولی شخصیت اور لیاقت کے مالک ہیں اور یہ کہنا
غلط نہ ہو گا کہ وہ بذاتِ خود مسلم لیگ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ
کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمانوں کا نصب العین ہے اور اُن
کا یہ قول ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ مسلمان من حیث القوم
پاکستان کو اپنا نصب العین بنا چکے ہیں۔ مسلم لیگ کے دوسرے
لیڈروں کے لیے اُن کے فیصلوں سے اختلاف کرنا یا اِن
کی بات ٹالنا آسان نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ اسی طرح اِن کے
قابو میں ہے جیسے مدرسے کے لڑکے کسی سخت گیر اُستاد
کے قابو میں ہوتے ہیں۔ وہ ہر موقعہ پر انھیں انگلی پکڑ کر
راستہ بتلاتے ہیں اور وہ ہمیشہ اِن کا بتلایا ہوا راستہ
اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کسی بنیادی مسئلہ پر کمیٹی کے ممبر سختی

---

(۱) موقر جنگ کراچی، اشاعت ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۰ کالم (۸،۱) از محترم رضوان احمد)

(۲) "آزادی کی کہانی میری زبانی" ص ۱۸۱-۱۸۲
"میں جب بھی ہاتھ ڈالتا ہوں تو کھوٹے سکے نکل آتے ہیں۔ لیاقت علی خان سمیت"
(مسلم لیگی لیڈر سردار شوکت حیات۔ موقر۔ سیارہ ڈائجسٹ جولائی ۱۹۸۶ء صفحہ ۲۳

سے اُن سے اختلاف کریں تو وہ استعفیٰ دینے پر تیار ہو جاتے
ہیں اور اس کے بعد بحث کی گنجائش نہیں رہتی . . . "

حالات ایسے تھے کہ بیرونی دُنیا میں یہود اور اندرون ملک ہندو پریس
کو "امتِ مسلمہ" کے معنی سمجھانے اور اسی بنیاد پر مسلم کاز کو روشناس کرانے میں
کامیابی سے زیادہ ناکامی کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ لہٰذا غیر ضروری خطرہ مول لینے
کے بجائے قائد نے بھی مسلم قوم MUSLIM NATION کا لفظ
استعمال کیا کہ یہی وقت کی ضرورت تھا۔ چنانچہ اسی کو تقسیم ہند کے لیے "دو قومی
نظریہ" قرار دیدیا گیا۔ ۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ میں دوسری قوم کے بادزنی وجود
کا ذکر کرتے ہوئے قائد نے فرمایا:۔

"اگر کانگریس یہ خیال کرتی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ پریشانی اور
افتراق سے فائدہ اٹھا کر وہ مسلمانوں کو چند ٹکڑوں پر راضی کرے گی تو
وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلم لیگ میں اب ایک
نئی روح پیدا ہو چکی ہے اور وہ ہندوستانی سیاسیات میں برابر کا حصّہ
لیگی۔ دو قومی نظریہ کو جس قدر جلد سمجھ لیا جائے اتنا ہی مفادِ عامہ
کے لیئے مناسب ہے۔"

قائد کی اس تقریر نے "مہاتما" کے کان کھڑے کر دیئے۔ مکاری سے رام کرنے
کی کوششیں میں پورے اندازِ مہاتمائی کے جلوے میں آکر نہایت بھولے پن سے خط
لکھا کہ:۔

"لکھنؤ میں آپ نے جو تقریر کی ہے وہ شروع سے
لیکر آخر تک ایک اعلانِ جنگ ہے۔ میرا خیال تھا کہ
دونوں جماعتیں مجھے ایک واسطہ خیال کرینگی لیکن

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ تجویز پسند نہیں جس کا مجھے
افسوس ہے۔ لڑائی میں فریقین ہوتے ہی ہیں۔ اگر میں
آپ میں صلح نہ بھی کرا سکا تو آپ مجھے فریق بھی نہ
پائیں گے۔"

۱۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو قائد نے جواب دیا:۔

"مجھے تعجب اور افسوس ہے کہ میری لکھنؤ والی تقریر کو آپ
اعلان جنگ سمجھ رہے ہیں، حالانکہ یہ قطعی مدافعانہ تقریر
تھی۔ ازراہ کرم آپ اسے دوبارہ پڑھیں اور اس کو سمجھنے
کی کوشش کریں۔ افسوس ہے کہ گذشتہ ایک سال میں
جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان پر آپ کی نظر نہیں ہے۔
یہ درست ہے کہ آپ کانگریس کے ابتدائی رکن بھی نہیں
ہیں، تاہم اس سے انکار مشکل ہے کہ کانگریس کی قیادت
آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے جو مکتوب تحریر
کیا ہے، اس کے لیے شکر گذار ہوں۔ لیکن مجھے معاف
کیا جائے، اگر میں یہ کہوں کہ اس میں کوئی مفید اور
ٹھوس عملی تجویز نہیں ہے۔"

"امت مسلمہ" کا ارفع تصور ہمیشہ قائد کا جزو ایمان رہا۔ "مسلم قوم" کا
سیاسی نقطۂ نظر سے ادعا کرتے ہوئے بھی کہ یہی "وقت کی ضرورت" تھا۔ قائد
نے وسیع المعنی "امت" کو کسی اور طور پر "قوم" یا "قومی" کے گھٹیا تصور سے
ہم کنار کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ اور ایک وقت تو لفظ "قوم پرست" کے مکارانہ
استعمال پر گاندھی جی کو بھی بری طرح جھاڑ دیا۔ جب فروری ۳۸ میں اس قلاباز

مہاتما نے پینترا بدلتے ہوئے لکھا :-

"آپ نے اپنے خط میں تحریر کیا ہے کہ آپ کی تقریر اعلانِ جنگ نہیں ہے لیکن آپ کے بعد کے بیانات میرے پہلے خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔ آپ کی تقریر میں "پرانا قوم پرست" نظرانداز ہو گیا ہے۔ جب میں ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے واپس آیا تو آپ ایک قوم پرست تھے۔ ہر ایک آپ کو قوم پرست ہی سمجھتا تھا اور آپ ہندو اور مسلمانوں کی ایک امید تھے۔ کیا آپ وہی مسٹر جناح ہیں؟ اگر آپ اپنی تقریر کے باوجود وہی جناح ہیں تو میں آپ کے الفاظ قبول کرتا ہوں۔"

خط ملنے کے بارہ دن بعد قائد نے جواب دیا۔

"آپ نے لکھا ہے کہ میری تقریر سے "قدیم قوم پرستی" کے جذبات مفقود ہیں۔ کیا آپ اپنے آپ کو ایسا کہنے میں حق بجانب خیال کرتے ہیں؟ میں کبھی یہ نہیں سوچتا کہ لوگ ۱۹۱۵ میں آپ کو کیا کہتے تھے اور آج آپ کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں۔ "قوم پرستی" کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور ان ایام میں اس کی وضاحت بہت مشکل ہے، لیکن میں آئندہ مزید ایسے طریق خط و کتابت کو پسند نہیں کرتا۔"

• اس دندان شکن جواب نے کانگریس کے اس مہاتما کو یقین دلا دیا کہ اب یہ شاہین "قوم" یا "قوم پرست" کے کسی کرگسی قالب میں آنے کا نہیں۔

ستمبر ۱۹۳۸ء میں یورپی سرحدات کی تیزی سے بدلتی صورت حال نے "کثرتِ آبادی اور حقِ خود ارادی" کی بنیاد پر قائد کے لیے مطالبہ تقسیم ہند کی راہ ہموار کردی جب نازی وار الٹی میٹم سے ڈرے سہمے برطانوی وزیر اعظم نیول چیمبرلین نے "میونک کانفرنس" میں فرانسیسی وزیر اعظم اور اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی کے ساتھ شرکت کر کے جس میں چیکوسلواکیہ کے نمائندے کو شرکت کی اجازت تک نہیں دی گئی تھی۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کی رات دو بجے سوڈیٹن لینڈ کی واپسی جرمنی کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔

جرمن زبان و جرمن نژاد آبادی کی لازماً دانش کو واپسی کے ساتھ ملحقہ مخلوط النسل آبادی میں "الحاقی خواہش" رکھنے والی اقوام کی رائے معلوم کرنے کی نسبت جرمن مطالبہ کی شقیں اس طرح تھیں:-

(۱) چیکوسلواکیہ کے جن علاقوں میں پچاس فیصد سے زائد جرمن آباد ہیں وہ فوراً جرمنی کے حوالے کر دیئے جائیں۔

(۲) جن علاقوں میں آبادی مختلف النسل اقوام پر مشتمل ہے وہاں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آبادی کے تبادلے کا کام بین الاقوامی کمیٹی کے زیرِ نگرانی کیا جائے۔

(۳) چیکوسلواکیہ کی فوج میں جرمن زبان بولنے والے سپاہیوں اور افسروں کو برخواست کر دیا جائے۔

(۴) دوسرے ملحقہ علاقوں میں بذریعہ رائے شماری معلوم کیا جائے کہ وہاں کے باشندے کس ریاست میں رہنا چاہتے ہیں۔ (وغیرہ)

"SUBJECT TO SUCH TERRITORIAL
ADJEST MENTS —— AS
MAY BEFOUND NECESSARY."

نے جملے کی یہ پہلی ایجاد تھی جو "قانونِ ضرورت" کی طاقت کے سامنے کی گئی جس کی رُو سے جرمن زبان و جرمن نژاد آبادی کی بنیاد پر سوڈیٹن لینڈ کو چیکوسلواکیہ سے علیحدہ کرکے واپس نازی جرمنی میں شامل کیا گیا جس کو معاہدۂ سینٹ جرمین ۱۹۱۹ء کے ظالمانہ معاہدے کے ذریعہ ریاست چیکوسلواکیہ کی تشکیل کے لیے زبردستی "جرمن آسٹریا" سے چھین لیا گیا تھا۔

۴ر اکتوبر ۳۸ء کو "المیۂ میونک" کے عنوان سے برطانوی دارالعلوم کے ہنگامہ خیز اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر چرچل نے کہا کہ :۔

"اس موقعہ پر کہ برخٹیسگڈن، گوڈسبرگ اور پھر میونک میں کیا کچھ ہوا، مکرر دُہرانے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ اس طویل سہ روزہ اجلاس کے دوران اِن امور پر کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ اس ساری تفصیل کو، اگر ایوان اجازت دے تو میں مختصراً یوں بیان کروں گا کہ پہلے ہمیں پستول دکھلاکر ایک پونڈ طلب کیا گیا۔ جب دیدیا گیا تو اس نے پستول دکھلا کر دو پونڈ طلب کیے۔ بالآخر جرمن ڈکٹیٹر ایک پونڈ، سترہ شلنگ اور چھ پینس لینے پر رضامند ہوگیا اور بقیہ ڈھائی شلنگ کے بدلے میں مستقبل میں خوشگوار تعلقات رکھنے کے وعدے دیکر مطمئن کردیا۔ جناب صدر! میونک کے معاہدے کے ذریعہ ہمیں مکمل اور غیر مشکوک شکستِ فاش ہوئی ہے"۔۔۔۔۔!

بیچارے چرچل کو کیا معلوم تھا کہ اِسی کثرتِ آبادی۔۔۔۔ اور ہوسکے تو زبان کی بنیاد پر ۔۔۔۔ تقریر کے تقریباً نو سال بعد ۔۔۔۔ اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت کو ایک اور مکمل اور غیر مشکوک شکستِ فاش ہونے والی ہے۔۔۔۔!

اسی ماہِ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں قائداعظمؒ نے کراچی میں سندھ صوبائی مسلم

لیگ کانفرنس کی صدارت فرمائی ۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے اعلان کیا کہ:-

"میں برطانوی سیاست دانوں اور مدبّروں اور ساتھ ہی ساتھ کانگریسی اعلیٰ کمان کے اراکین کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان سے عرض کروں گا کہ وہ تازہ معاشرتی انقلاب، تیز رو تبدل اور اس کے نتائج و عواقب کو جو عالمی جنگ کا اندیشہ پیدا کرنے کا باعث ہو گئے ہیں بہ نظرِ غائر دیکھیں، انہیں سمجھیں اور نہایت خاموشی سے دل ہی دل میں انہیں ترتیب دے لیں۔ اس کا واحد سبب محض سوڈیٹن جرمن تھے جنھیں چیکو سلواکیہ کی اکثریت کے بھاری بوجھ کے نیچے جبراً دبا دیا گیا تھا اور چیکو سلواکیہ والوں نے جور و جبر کے ذریعہ انہیں مضمحل کر دیا تھا، ان سے بدسلوکی کی تھی، ظلم و تشدد کیا تھا اور بیس برس تک جن کے حقوق پامال کیے گئے تھے اور جن کے مفادات کو انتہائی سنگدلی کے ساتھ پسِ پشت ڈال دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کا لابدی نتیجہ جو برآمد ہو سکتا تھا۔ وہی ہوا، یعنی یہ کہ

جمہوریۂ چیکو سلواکیہ منہدم ہو چکی ہے اور اب ایک نیا نقشہ ترتیب دیا جائے گا۔ بعینہٖ جس طرح سوڈیٹن جرمن بے یار و مددگار اور بغیر کسی دفاعی قوت کے نہ تھے اور بیس سال تک ظلم و تشدد اور جور و ستم کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود زندہ اور باقی رہے، اسی طرح مسلمان بھی بے یار و مددگار اور مدافعانہ قوت سے عاری نہیں ہیں اور برعظیم میں اپنے قومی وجود اپنی قومی آرزوؤں اور تمناؤں سے دست بردار نہیں ہو سکتے ہیں"[1]

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو عین اس دن، جب سوڈیٹن لینڈ ایریا کی تیسری اور آخری قسط معہ اسکواڈ کے اسلحہ ساز کارخانوں اور جملہ تنصیبات کے جن کا جرمنی کے

---

(۱) بشکریہ مضمون محترم شریف الدین پیرزادہ شائع شدہ موقر ماہ نامہ "پندرہویں صدی" کراچی - جولائی ۱۹۸۵ء

بعد پورے یورپ میں کوئی جواب نہیں تھا۔ کروڑوں پونڈ کی تعمیر شدہ جنگی زیگفرڈ لائین کے ساتھ واپس جرمنی کو جمع کرائی جا رہی تھی۔ قائدِ اعظمؒ کی صدارت اور رہنمائی میں ممتاز و معروف خلافتی رہنما شیخ عبدالمجید سندھی کی پیش کردہ حسبِ ذیل قرارداد کانفرنس نے منظور کی :-

"سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس وسیع و فراخ برعظیم ہند کے قیامِ امن کے مفاد میں اور بے روک ٹوک ثقافتی تعمیر و ترقی، معاشی اور سماجی بہبود اور دونوں قوموں کی جو ہندو اور مسلمان کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں، سیاسی حقِ خود ارادی کے مفادات کے پیشِ نظر یہ چیز قطعی طور پر ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان دو وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔ چنانچہ یہ کانفرنس کل ہند مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایک ایسی اسکیم وضع کرے جس کے مسلم اکثریتی صوبے، مسلم دیسی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے۔ اپنے ایک ذاتی وفاق کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہندوستانی سرحدوں کے اُس پار واقع دوسری کسی بھی مسلم ریاست کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ وفاق میں شامل ہو سکے اور یہ کہ غیر مسلم اقلیتوں کے لیے وہی تحفظات اس آئین میں رکھے جائیں جو غیر مسلم فیڈریشن میں بسنے والی مسلم اقلیتوں کو فراہم کیے جائیں۔"

یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مطالبہ —— یہ آواز وہی تھی جو چودھری رحمت علی نے پہلی بار ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی "بزمِ شبلی" میں بلند کی تھی اور جس کے لیے اُنہوں نے زندگی بیتا دی۔ یہ باور کرنے کی وجہ موجود

ہے کہ ۱۹۳۰ء سے قائد اور چودھری رحمت علی دونوں اس بات پر متفق تھے کہ مسلمانوں کو علیحدہ قومیت کے اعلان اور مسلم قوم کے علیحدہ آزاد و خود مختار فیڈریشن کے مطالبہ کے سوا ہر بات فضول ہے ـــــ بے سود ہے۔!

سندھ صوبائی مسلم لیگ کے اس "اسلامی بم" سے جو دھماکہ پیدا ہوا اس نے اگر ایک طرف برطانوی ڈپلومیسی میں دراڑیں ڈال دیں تو دوسری طرف کانگریس مندر کی بنیادوں تک کو ہلا دیا ـــــ اس اجتماعی آواز کو ـــــ اس "قم باذن اللہ" کی للکار کو اب کوئی بھی شخص "طالب علموں کی اسکیم" یا "نام و نمود کی محفل" نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب یہ عملی طور پر مسلمانوں کی طاقتور سیاسی جماعت مسلم لیگ کی قرارداد تھی اور مسلمانانِ ہند کا اجتماعی مطالبہ جس نے برطانیہ کے اراکینِ حکومت اور برعظیم کے مسلم و غیر مسلم سیاست دانوں کو اس کے نشیب و فراز کی بات اپنے اپنے انداز سے غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا۔ بغیر کچھ سوچے، قائد کے اندازِ سیاست پر غور کیئے بغیر کہ تفصیل بعد میں اور اصول پہلے منوایا جاتا ہے اپنی سادہ لوحی و سادگی کے زیرِ اثر ہند کے مختلف گوشوں سے لوگوں نے چودھری رحمت علی پلان پر اپنی اسکیمیں اور رنگ برنگی نقشے شائع کرنا شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ کہ ان اسکیموں اور نقشوں کی اشاعت سے ہندو لیڈروں اور انگریزوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا جن کے ہاتھوں میں مسلمانوں کے مطالبۂ تقسیمِ ہند کی ہر ممکنی و امکانی تفصیل بلا تکلّف و تکلیف پہنچ گئی جس سے ایک طرف یہ اندازہ کرنے میں حریفوں کو مدد ملی کہ مسلمان اگر کچھ طلب کریں تو کیا کچھ طلب کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف تفصیلات کی وجہ سے یہ مواقع بھی مخالف سیاست دانوں کو فراہم ہوئے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں انتشار و خلفشار کی تخم ریزی کس کس طرح کی جائے۔ چودھری رحمت علی کی اسکیم پہلے سے موجود تھی اور "ہاتھی گرا بھی تو سوا لاکھ" کے عنوان سے ایسی تھی کہ اگر اس کو گھٹانے

کی کوشش بھی حریفوں کی طرف سے کی جاتی تو وہ بھی گھٹتے گھٹتے بہت بڑی چیز باقی رہتی۔(۱)

دی انڈین اینول رجسٹر، ۱۹۳۸ء، جلد دوم سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ تحریک و تاریخ پاکستان کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہے۔ "دو وفاق۔ مسلم اور غیر مسلم" کے عنوان کے تحت تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے کہ:۔

ثقافت کے نام پر نئی مسلم قیادت مُلک کی کسی چیز کو خاطر میں لائے بغیر ہندو منطقے اور مسلم منطقے میں تقسیم کردے گی۔ اِن مہینوں کے دوران ہم یورپ میں واقع ہونے والے ایک ایسے حادثے کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے جو ان کو (یعنی مسلم قیادت کو) یہ سوچنے پر اُکساتا ہے بلکہ بہت افزائی کرتا ہے کہ جس طرح سوڈیٹن جرمن، چیکوسلواکیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی ریاستِ ہند سے اُن علاقوں کو حاصل کرنے میں حق بجانب ہوں گے جہاں مسلمان آباد ہیں۔ اقوام کے حقِ خود ارادی کے نام پر سوڈیٹن علاقہ چیکوسلواکیہ سے منقطع ہو گیا اور چھن گیا لہٰذا اسی اصول پر مسلمان، ہندوستان کے عین قلب میں مسلم ریاستوں کو قائم کرنے کا مطالبہ کرسکتے ہیں خواہ ہندوستان کے ایک نئے نقشے پر اس اسکیم کو مقام عطا کرنے کے لیے آبادیوں کے انتقال اور لامحدود تبادلے کی ضرورت ہی کیوں نہ پڑ جائے۔ اسی قسم کی خواہش اور آرزو کا یہ سارا شاخسانہ ہے اور یہی سارا جذبہ کارفرما ہے کہ سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کے آخری اجلاس میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو مسٹر محمد علی جناح

---

(۱) بشکریہ مصنف۔ چودھری رحمت علی" شائع شدہ "مڈویک میگزین- روزنامہ جنگ کراچی ۲۵ فروری ۱۹۸۷ء

کی صدارت میں ایک قرار داد متذکرہ بالا کے پیشِ نظر منظور کی گئی۔" (۱)

بَرخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے کہ "حقِ خود ارادی" اور "اختیار علیحدگی" کا حق اور تصور نازی جرمنی نے قائد کی ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء کی "ساری کانفرنس" کی تقریر سے لیا ہے تو غلط نہ ہوگا جب ساری کانفرنس کی ایک بڑی کمیٹی نے اپنے تیسرے اجلاس میں جو "برما سب کمیٹی" کی سفارشات پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی یہ رائے پیش کی کہ "برما کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے" تو اس مالکانہ اختیار کی قائد نے شدید مخالفت کی اور کہا کہ "یہ فیصلہ آپ نہیں کر سکتے" اس کا اختیار صرف اور صرف باشندگانِ برما کو حاصل ہے کہ وہ اگر علیحدہ ہونا چاہیں تو ٹھیک ہے، پھر ان کی راہ میں رکاوٹ کوئی پیدا نہ کی جائے۔" ہو سکتا ہے اُس وقت کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہو کہ قائد علیحدگی کے تصور کے خلاف ہیں اور کچھ نے یہ جانا ہو کہ اُنھوں نے مخالفت نہ کرتے ہوئے اس اُصول کی توثیق کروائی کہ اگر کوئی قوم علیحدہ ہونا چاہیے تو یہ حق اُسی کا ہے کہ وہ علیحدہ ہو سکے اور اسی کو حقِ خود ارادی کہتے ہیں اور اگر ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے سوڈیٹن جرمنوں کے لیے قائد کے اُصول "حقِ خود ارادی" سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اُسے بین الاقوامی اُصول کی شکل دیدی تو اس میں حیرانی اور اُلٹا قائد کو مقلد ہونے کا الزام دینے کی کیا بات ہے۔ خصوصاً جب کہ یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو قائد نے اپنے دوست عبدالمتین چودھری کو ایک خط میں لکھا بھی تھا کہ ہندوستان کی تقدیر میں لکھا ہے کہ منقسم ہو کے رہیں گے۔ صاف ظاہر ہے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کی سندھ صوبائی اسمبلی کی قرار داد کسی

---

(۱) بشکریہ مضمون محترم شریف الدین پیرزادہ شائع شدہ موقر ماہنامہ "پندرہویں صدی" کراچی جولائی ۱۹۸۵ء

طور پر بھی "میونک پیکٹ" کا چربہ" آرزو و خواہش کا شاخسانہ "نہیں تھی (۱)

۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو TIME AND TIDE. لندن، میں

اپنے ایک مضمون میں مجوزہ آئینِ ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد نے لکھا :

"ہمیں اس ملک (ہندوستان) کے لیے ایسا آئین وضع کرنا چاہیے جو اس حقیقت پر مبنی ہو کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں اور جس کی رُو سے دونوں قومیں اپنے مشترک وطن کی حکومت میں برابر کی حصّہ دار ہوں۔"

TIME AND TIDE. حوادثِ زمانہ کے سبب بند ہو چکا ہے لیکن یہ وہ مضمون ہے جسے ہم قائد کا "پہلا سرکاری بیان" کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد غالباً جناح نے پھر کبھی ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا "مشترک وطن" نہیں کہا۔

چودہ دن بعد ہی ——— ۲۳ مارچ ۴۰ کو وہ "قرارداد لاہور" پیش ہوئی جسے دنیا "قراردادِ پاکستان" کے نام سے جانتی ہے اور جس کے مخدوش خطرناک۔ ڈرافٹ کی تیاری کی نسبت "ڈرافٹنگ کمیٹی" کے تینوں اراکین، چودھری خلیق الزماں۔ عبدالمتین چودھری اور نواب اسمٰعیل خان نے اپنی لاعلمی ولاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔ قراردادِ لاہور کی پیش رفت کے لیے جو بڑی حد تک "قرارداد الٰہ آباد" کا چربہ ہے ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کی شب میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور دوسرے روز یعنی ۲۲ مارچ ۴۰ء دن کو سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ صدر کی تقریر کی روشنی میں ورکنگ کمیٹی نے جو قرارداد مرتب و پیش کی وہی سبجکٹ کمیٹی کے سامنے آئی اور اس پر بڑی تفصیل سے بحث ہوئی۔

---

(۱) بشکریہ صاحبِ مضمون "چودھری محمد علی" شائع شدہ "مڈویک میگزین" "روزنامہ جنگ کراچی) ۴ تا ۱۰ فروری ۱۹۸۷ء صفحہ ۹

۲۳ مارچ کی شام، منٹو پارک کے کھلے اجلاس میں یہ قرارداد پیش ہوئی:۔

قرارداد لاہور

منظور شدہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ، لاہور

۲۲-۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

(۱) آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اُس اقدام کی تائید و توثیق کرتے ہوئے جو اُن کی ۲۷ اگست ۱۷-۱۸ ستمبر ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کی قراردادوں سے واضح ہوتا ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پُر زور اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ، جس کا اظہار گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کیا گیا ہے، قطعاً غیر موزوں، اس ملک کے خاص حالات کے پیش نظر ناقابلِ عمل اور مسلم ہندوستان کے لیے یکسر ناقابل قبول ہے۔

(۲) اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو جو اعلان وائسرائے نے حکومتِ ملک معظم کی جانب سے کیا تھا، وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس پالیسی اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء مبنی ہے، اُس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں، مفادات اور فرقوں کے مشورے سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے لیکن مسلم ہندوستان اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا جب تک پورے آئینی منصوبے پر از سرِ نو غور نہ کیا جائے اور کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا، تاوقتیکہ وہ اُن کی رضامندی اور منظوری سے مرتب نہ کیا جائے۔

(۳) قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اِس ملک میں قابلِ عمل نہیں ہوگا تاوقتیکہ وہ مندرجۂ ذیل بنیادی اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو۔ یعنی جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردوبدل کے ساتھ)[1] کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے اُن کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے۔ جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں۔[2]

نیز اِن وحدتوں اور خطوں میں، اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب، موثر اور حکمی تحفظ اِن کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کے اور دیگر اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب، مؤثر اور حکمی تحفظ اِن کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔

مزید برآں، یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ

---

(۱) "SUBJECT TO SUCH TERRITORIAL ADJUSTMENTS – AS MAY BE FOUND NECESSARY."

۲۲ مارچ ۴۰ء کے دن سبجکٹ کمیٹی کے اجلاس کے دوران ہی مشہور مسلم لیگی لیڈر پیر علی محمد راشدی صاحب نے یہ خوبصورت "CUT THROAT" پیش کیا۔ جسے بقول ان کے سر سکندر حیات اور جناح صاحب نے سرسری نظر دیکھ کر شامل مسودۂ قرارداد کر لیا ــــ؟ (وضاحتِ مضمون، موقر جنگ کراچی - ۲۴ جنوری ۱۹۸۲ء صفحہ ۳ کالم ۲،۳)

(۲) "اِس اجلاس کے کچھ عرصے بعد جناح صاحب نے مطلوب الحسن سید سے جو لاہور کے اجلاس میں موجود تھے کہا۔ "اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بالآخر وہی فیصلہ کیا جس کی انھیں آرزو تھی۔"

(کتاب محمد علی جناح (ہیکٹر بولائیتھو) مترجمہ جناب زبیر صدیقی صفحہ ۲۰۰-۲۰۱)

اِن بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ مرتب کریں
جس کی رُو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کُلّی اختیارات حاصل ہو جائیں
مثلاً دفاع اُمورِ خارجہ، مواصلات، محصولات اور دیگر ایسے اُمور جو
ضروری سمجھے جائیں۔"

"**سخت** گیر اُستاد" کے "حکم" پر اگر مسٹر اے، کے فضل الحق نے جو
اُن دنوں بنگال کے وزیرِ اعلیٰ تھے، قرارداد کی "قرأت" کی تھی تو مبینہ "کم ظرف و
زبان دراز" چودھری خلیق الزماں، ایم ایل اے، یو۔پی نے تائید کی اور حسب
ذیل "یس سر" اور "جی حضوریوں" نے گویا انگوٹھے لگائے:۔

(۱) مولانا ظفر علی خان ایم ایل اے (مرکزی) پنجاب (۲) سردار اورنگ زیب
خان ایم ایل اے (سرحد) (۳) حاجی سر عبداللہ ہارون، ایم ایل اے (مرکزی)
سندھ (۴) خان بہادر نواب محمد اسمٰعیل خان ایم ایل سی بہار (۵) قاضی محمد عیسیٰ صدر
مسلم لیگ بلوچستان (۶) عبدالحمید خان، ایم ایل اے مدراس (۷) آئی آئی چندریگر ایم
ایل اے بمبئی (۸) سر عبدالرؤف شاہ ایم ایل اے سی پی (۹) ڈاکٹر محمد عالم ایم ایل اے
پنجاب (۱۰) سید ذاکر علی، یو پی (۱۱) بیگم صاحبہ مولانا محمد علی، یو پی، (۱۲) مولانا عبدالحامد
بدایونی ________!

چودھری صاحب نے بر وقت اس بلینڈر پر اپنے قائد کو یوں
متوجہ نہیں کیا کہ اُن کے خیال میں عین وقت ایسا کرنا مسلم لیگ کو فوری طور پر
انتشار میں مبتلا کرنا تھا۔ ایسا انتشار جس سے ممکن تھا مسلم لیگ کا نظام ہی
درہم برہم ہو جاتا۔ لہٰذا مرض کو بگڑنے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اُنھوں نے بڑے خلوص
اور دیانت داری سے مریض کو نہ صرف یہ کہ تختۂ دار تک پہنچنے میں امداد دی بلکہ بڑے
پیار سے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہوئے رخصتی مصافحہ بھی کیا کہ "چڑھ جا

بھائی سولی پہ رام بھلی کرینگے۔"

اور بقول شخصے چودھری صاحب کے "پیور" دباتے ہی "اسلامیانِ ہند" کی نعش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نئے "مسلم علاقائی" حد بند اضلاع کے کنوئیں میں گر گئی اور جہاں شمالی آسام۔ مشرقی پنجاب۔ مغربی بنگال اور یوپی وغیرہ میں ان کے ٹکڑے گرے وہاں سکھوں اور کانگریسی جاٹوں نے اس اکبری لاش کی ہڈیوں تک کو سرمہ بنا دیا یہ تھی وہ بھاری قیمت جو خطبۂ الہ آباد پر انحصار اور خلیق الزماں کی "مصلحت" کے نتیجے کے طور پر قرارداد کو ادا کرنی پڑی۔ وہ قرارداد لاہور ——— جسے دُنیا آج بھی "قراردادِ پاکستان" کے نام سے جانتی ہے اور جس کے "کلۂ مینار" کو تاریخِ پاکستان نے "مینارِ پاکستان" کا نام دیا ہے ——— !

قرارداد پاکستان کی منظوری کو بھی وائسرائے ہند لارڈ لن لیتھگو نے گاندھی کے مرن برت یا کانگریس کی عادتاً بیہودہ مطالباتی قرارداد جانا۔ چنانچہ دو ہی دن بعد ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو وائسرائے ہند نے وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ کو خط لکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ:-

REGARDING THE PARTITION RESOLUTION OF THE ALL INDIA MUSLIM LEAGUE, LORD LINLITHGOW. VICEROY OF INDIA, WROTE TO THE SECRETARY OF STATE FOR INDIA, LORD ZETLAND AS FOLLOWS:

25 March 1940:

I do not attach too much importance to Jinnah's demands for, the carving out of India into an indefinite number of religious areas or if one prefers to use the phrase an indifinite number of so called "Dominions," and I would judge myself that his attitude at the moment is that, as Congress are putting forward a preposterous claim which they know is incapable of acceptance, he equally will put forward just as

extreme a claim of the impracticibility of realising which he is probably just as well aware, but the existence of which will, while re-affirming the Muslim attitude of hostility to Congress claims, take away some at any rate, of the damaging charges which have hither-to been levelled against them that they have no constructive ideas of their own.

"میں جناح کے اِن مطالبات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا کہ ہندوستان کو ایک غیر معینہ تعداد کے مذہبی خطوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آپ چاہیں تو خطوں کی بجائے ڈومینین کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں مسٹر جناح کا موجودہ رویّہ کچھ اس طرح کا ہے کہ چونکہ کانگریس ایک بے ہودہ مطالبہ کر رہی ہے جو وہ خود جانتی ہے قابلِ قبول نہیں اس لیے وہ بھی ایک ویسا ہی ناقابلِ عمل مطالبہ پیش کریں انہیں خود بھی احساس ہے لیکن انہیں اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اس سے ایک طرف کانگریس کے مطالبہ کے بارے میں مسلمانوں کا مخالفانہ رویّہ واضح ہو جائے گا دوسری طرف اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں کے بارے میں یہ جو الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس واضح نظریات نہیں ہیں، اس کا وزن کم ہو جائے گا۔"

۵ راپریل ۱۹۴۰ء کو سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہند لارڈ زٹلینڈ نے وائسرائے کے خط کا جواب دیا:۔

LORD ZETLAND'S REPLY TO LORD LINLITHGOW
5 April 1940:

"I think that in the course of forthcoming debate I shall be bound to express my disent from the proposals which have recently been put forward by the All India Muslim League in the course of their recent Conference at Lahore. I would very much doubt whether they have been properly thought out and in any case to create a

number of Ulsters in India would not only mean the wrecking of all that we have been working for a number of years past, but would also, I imagine, give rise to the most violent opposition of the Congress and possibly of others who are not actually attached to the Congress in India."

"میرا خیال ہے کہ (دارالعوام میں) جو بحث عنقریب ہونے والی ہے، اس میں مجھے لازماً ان تجاویز سے اختلاف کرنا پڑے گا جو آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی حالیہ کانفرنس منعقدہ لاہور میں پیش کی ہیں۔ مجھے بڑا شبہ ہے کہ ان پر اچھی طرح غور نہیں کیا گیا۔ بہرنوع ہندوستان میں بہت سے السٹر پیدا کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم سالہا سال سے یہاں جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ سب کالعدم ہو جائے گا بلکہ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کانگریس ان تجاویز کی شدید ترین مخالفت کرے گی اس کے علاوہ وہ عناصر بھی اس کی مخالفت کریں گے جن کا کانگریس کے ساتھ تنظیمی تعلق نہیں ہے۔"

پھر ۱۸ راپریل ۱۹۴۰ء کو برطانوی دارالامراء میں لارڈ زٹلینڈ نے آنسو بہائے۔

DEBATE IN THE HOUSE OF LORDS
12 April, 1940:

The Secretary of State for India (Lord Zetland):- "At their annual meeting at Ramgarh in the middle of March the Congress Party reiterated their original demand this meeting was followed by a meeting of the All India Muslim League at Lahore towards the end of the month, at which a resolution was unanimously adopted putting forward a scheme for the future government of India involving the partition of India with seperate Muslim and Hindu States. I am bound to say that while I appreciate fully the grounds on which the proposal is based, I cannot but regard it constituting something not far

short of despair, for its acceptance would be equivalent of admitting the failure of the devoted efforts of English men and Indians over a long period of concentrated efforts: for those labours have been based upon the assumption that even in the admitted diversity of India a measure of political unity could be achieved sufficient to enable India as a whole to take its place as an integral unit in the British Commonwealth of Nations."

"کانگریس نے اپنا سالانہ اجلاس منعقدہ رام گڑھ میں اپنے اصل مطالبہ کا اعادہ کیا۔ اس کے بعد اسی ماہ کے آخر میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس میں ایک تجویز پیش کی گئی، جس کے مطابق ہندوستان کو ہندو اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اگرچہ مجھے ان دلائل سے اتفاق ہے جن پر اس تجویز کی بنیاد رکھی گئی ہے لیکن میں اسے ایک مایوسانہ تجویز سمجھتا ہوں کیونکہ اُسے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی طویل مساعی کو مسترد کر دیا جائے۔ ان مساعی کی بنیاد یہ خیال تھا کہ اگرچہ ہندوستان کا معاشرہ ایک متنوع اور کثیر الاقوامی معاشرہ ہے اس کے باوجود اس قدر سیاسی وحدت برقرار رکھی جا سکتی ہے کہ ہندوستان ایک اکائی کے طور پر برطانوی دولت مشترکہ میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔"

پانچ ماہ بعد، ۱۶ ستمبر ۱۹۴۰ء کو وزیر ہند نے وائسرائے ہند لارڈ لنلیتھگو کو لکھا کہ:-

September 16, 1940:

"Your telegrams gave me anything but a favourable impression of Jinnah, who seems to be much more out for strengthening his own position with the Muslim League than for expressing the views of his fellow Muslims in helping the common cause. Have you formed any idea yet as to

what he really means by his Pakistan scheme? To my minnd, a complete break up of India on Ulster and Eire lines, seems a disastrous solution and one to hopes of peaceful progress in India. One of the essentials for the development of internal liberty is reasonable external security and definite boundaries. If our tradition is freedom loving and our domestic development is centuries ahead of the continent, that is largely because we are an island. If the Prussian tradition is one of militarism and aggression, it is largely because Prussia has never had any natural frontiers. Now India has a very real natural frontier at present. On the other hand, within herself, she has no natural geographic or racial or communal frontier. The North-Western piece of Pakistan would include a formidable Sikh minority. The North-Eastern part has a Muslim majority so narrow that its setting up as a Muslim state, or part of a wider Muslim state, seems absurd. Then there is the large Muslim minority in the United Province. The position of Muslim Princes with Hindu subjects, and vice versa. In fact, an all out Pakistan Scheme seems to me to be the prelude to continous internal warfare in India. On the other hand, there may be a great deal to be said, from the point of view of an agreed settlement, for a much looser Constitution with greater powers to the Provinces and States and the very minimum of power at the centre, so long as there is enough to keep India together from the point of view of foreign policy and defence.''

(آپ کے تار نے مجھے مسٹر جناح کا کوئی اچھا تاثر نہیں دیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کے مشترکہ مقصد کی خدمت سے زیادہ مسلم لیگ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی فکر ہے۔ کیا آپ نے ابھی تک کوئی رائے قائم کی ہے کہ ان کی

پاکستان اسکیم کا مطلب آخر کیا ہے؟ میری رائے میں تو اس کا
مقصد ہندوستان کی مکمل شکست و ریخت ہے۔ السٹر اور
آئرلینڈ کی طرز کا حل مجھے تباہ کن دکھائی دیتا ہے جس سے ہندوستان
کی پُرامن ترقی کی تمام امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ داخلی
آزادی کی ترقی کے لئے ایک لازمی شرط بیرونی خطرات سے
معقول تحفظ اور واضح سرحدات کی موجودگی ہے۔ اگر ہماری
(انگریز قوم کی) روایت آزادی پسندی کی ہے اور ہمارا داخلی
ارتقاء براعظم یورپ سے صدیاں آگے ہے تو اس کی وجہ
بہت حد تک یہ ہے کہ ہم ایک جزیرہ ہیں۔ اگرچہ پرشیا کی
روایت عسکریت اور جارحیت سے عبارت ہے تو اس کی
ایک وجہ یہ ہے کہ اسے کبھی فطری سرحدات نصیب نہیں تھیں۔
اس وقت ہندوستان فطری سرحدات رکھتا ہے لیکن داخلی
طور پر وہ کوئی فطری نسلی اور فرقہ وارانہ سرحدات نہیں رکھتا۔
(مجوزہ) پاکستان کا شمال مغربی حصہ اپنے اندر خاصی بڑی
سکھ اقلیت لئے ہوئے ہوگا۔ شمال مشرقی حصہ میں مسلمانوں کی
اکثریت اس قدر معمولی ہے کہ اسے ایک مسلم ریاست بنانا
یا ایک بڑی مسلم ریاست کا حصہ بنانا ایک لغویات ہوگی۔ پھر
یوپی میں بہت بڑی مسلمان اقلیت ہے۔ اسی طرح کا مسئلہ
ہندو رعایا والے مسلمان ریاستی حکمرانوں اور اس کے برعکس
صورت والی ریاستوں کا ہے۔ فی الحقیقت مجھے تو پاکستان کی
اسکیم ہندوستان کو مستقلاً داخلی تنازعات اور جنگی حالت سے

دوچار کرنے کے ہم معنی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس اگر اتفاق
رائے ہو جائے تو صوبوں کو زیادہ خودمختاری اور مرکز کو کم سے
کم اختیارات دے کر ایسا حل تلاش کیا جاسکتا ہے جو خارجہ
پالیسی اور ڈیفنس کے معاملات میں ہندوستان کو متحد رکھ سکے)

گاندھی جی کے "مہا تما ئی گیان" کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ سارے
عقلمندوں کی رائے ٹھکرانے کے بعد جب خود گھوم پھر کر اسی نتیجے پر پہنچتے تھے
تو خفت مٹانے کے لیے وہ اپنی بھجن منڈلی میں کہہ دیا کرتے تھے کہ "میں نے
اس سلسلے میں اپنی بکری[1] سے رائے لی تھی اور چونکہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا ہے
لہٰذا میں اس کو منظور کرتا ہوں"۔ کچھ یہی کیفیت چودھری صاحب کی ہے کہ ایک تو عیش
میں یادِ خدا نہ رہی "جب وہ "قائداعظم ثانی ——— ڈیگال آف ایشیا" کے
دور میں چین کی بنسری بجا رہے تھے دوسرے "خوفِ خدا" اس وقت آیا جب
وہ خود بسترِ مرگ کے قریب ہو کے مطمئن ہو گئے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کی
تردید کرنے والا کوئی باقی نہیں بچا ہے۔ لہٰذا "اعتراف" سے روحانی تسکین
حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ایک چھوڑ دو بکریوں سے رائے لیکر اپنی معرکۃ الآرا
کتاب "شاہ راہِ پاکستان" لکھی۔ پہلا خط کانگریسی زرخرید ملّا ابوالکلام آزاد کا
تھا جو اس نے ۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو انھیں لکھا تھا:۔

---

(۱) ابوالحسن نحوی "اخفش" (چندھیایا ہوا) علم نجوم کا مشہور امام ہے۔ عروض میں بحر مجتث اسی کی ایجاد ہے
معانی القرآن۔ کتاب الاشتقاق۔ کتاب العروض۔ کتاب الاصوات۔ کتاب معانی الشعر کے علاوہ کئی
کتابوں کا مصنف ہے۔ خلیفہ مامون الرشید عباسی کے دور میں گزرا اور دربارِ خلافت میں معزز رہا۔
۲۰۶ھ میں انتقال کیا (رح) مشہور ہے کہ اپنی بکری کو کان سے پکڑ کر اسے علم نحو کے ادق مسئلے سمجھاتا اور
پھر رائے لیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بکری کے مرنے پر جب یار لوگوں نے سری کو کھولا تو یہ دیکھ کر
حیران رہ گئے کہ بکری کا سارا بھیجہ پگھل کر بہہ چکا تھا۔!

"بے شک آپ نے خود غرضوں اور بداندیشوں کے
ہاتھوں بہت کوفت اور تکلیف اٹھائی ہے مگر آج
وہی لوگ اپنے کئے پر پشیمان ہیں اور آئندہ اس
سے بھی زیادہ پچھتائیں گے۔ آپ اپنے زمانہ کے
واقعات صاف صاف، بے رُو رعایت لکھ ڈالیں۔
وہ زمانہ نہایت پُر پیچ اور انتہائی کشمکش اور
مناقشت کا تھا۔ اس کے جاننے والے تو اب
بھی بہت ہوں گے۔ مگر اس کو سمجھنے والے کہاں۔!
اس کی اصل حقیقت وہی لکھ سکتا ہے جو اس
خطرناک دریا میں کُودا، تہہ تک پہنچا۔ ہاتھ پیر
مارے اور پھر اُبھر آیا ——— "(۱)

چنانچہ ابھرتے ابھرتے انھوں نے دوسرا خط پڑھا جو کل پاکستان
انجمن ترقی اُردو کے صدر جناب عبدالحقؒ، بابائے اردو نے انھیں ۹ مارچ ۱۹۵۹ء
کو لکھا تھا:-

شفیق مکرمی جناب چودھری خلیق الزماں صاحب زاد لطفکم۔
"آپ کے خود نوشت سوانح میں وہ اوراق میں نے
دیکھے۔ جن میں آپ نے زبان سے بحث کی ہے۔
آپ کا مقصد کوئی تحقیقی مقالہ لکھنا نہ تھا بلکہ یہ اور
بعض دوسرے امور فنون لطیفہ کے قبیل کے بطور
پس منظر کے ہیں اور اس اعتبار سے جو کچھ آپ نے

۱- شاہ راہ پاکستان

لکھا ہے وہ آپ کے مقصد کے لیے کافی ہے۔

ہم جو کچھ سُننا چاہتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔

وہ باتیں نہ رپورٹوں میں ہیں نہ قرار دادوں میں اور نہ اخباروں کے بیانات میں۔ وہ آپ کے سینے میں ہیں۔ آپ نے سیاست میں اُس وقت قدم رکھا تھا جب آپ طالب علم تھے۔ اُس وقت سے اب تک علم سیاست سے گہرا تعلق رہا ہے۔ آپ کانگریس، خلافت، مسلم لیگ اور پاکستان تحریک میں شریک رہے شریک ہی نہیں رہے، غالب رہے اور ان معرکوں اور تحریکوں میں نمایاں حصّہ لیا جو ہماری سیاست کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن میں بہت کچھ تحریر میں آ گیا ہے لیکن اس کے علاوہ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو اب تک تحریر میں نہیں آئیں اور صیغۂ راز میں ہیں۔ اس طویل مدّت میں بہت سے ایسے مواقع آئے ہوں گے کہ آپ کو مخالف گروہوں کے سربراہوں سے خاص خاص مسائل پر گفتگو کرنی پڑی ہو گی۔ خود اپنی جماعت کے لیڈروں سے بعض نازک موقعوں پر اختلاف کرنا پڑا ہو گا۔ بعض قرار دادیں آپ نے ایسی پیش کی ہوں گی جن پر ہماری کامیابی کا انحصار تھا۔ بہت سی باتیں ہوں گی جن کا اظہار عام طور پر نہیں کیا گیا اور خفیہ ہیں۔ یہ سب راز آپ کو بے کم و کاست لکھنے ہوں گے۔ کانگریس

مسلم لیگ۔ خلافت سے تعلقات اور اختلافات کے صحیح
اور مکمل حالات ابھی بر سرِ عام نہیں آئے ہیں۔ اس میں
بعض ایسے کھانچے ہیں جنہیں بھرنے کی ضرورت
ہے۔ آپ سے بڑھ کر ان تحریکوں سے کوئی واقف
نہیں۔ آپ ایک مدت تک ان تحریکوں میں پیش
پیش رہے ہیں۔ بعض اوقات بعض چھوٹی چھوٹی باتیں
یا معمولی حقیر واقعہ، سیاست کا رخ بدلتے اور انقلاب
پیدا کر دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذرا سے اشارے
یا نکتے سے قرارداد کی حیثیت کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے یا ایک
آدھ لفظ بدلنے یا جملوں کے تقدیم و تاخیر سے معمولی
تجویز عظیم الشان منصوبے کی صورت اختیار کر لیتی ہے
عام واقعات تو سامنے آجاتے ہیں لیکن اندرونی باتیں
جو ان واقعات کی جان ہیں سامنے نہیں آتیں۔ آپ کو اپنی
خود نوشت سوانح میں ان سب باتوں پر روشنی ڈالنی ہوگی۔
اس سے بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی اور بہت
سی باتوں کی تردید ہو جائے گی۔ آپ کا یہ بڑا کارنامہ
ہوگا اور ہمارے زمانے کی سیاسی تاریخ میں اس کا خاص درجہ
ہوگا ——— والسلام۔"(۱)

چنانچہ "راز" پر سے پردہ اٹھانے اور اپنے "کارنامہ" "شاہ راہِ پاکستان" لکھنے کی وجوہات کو بادزنی قرار دیتے ہوئے چودھری خلیق الزماں نے لکھا۔

۱۔ شاہ راہِ پاکستان۔ صفحہ (۱۰۲۷)

"میں چودہ برس اپنے قلم اور زبان کو سیکڑوں الزام لگانے والوں کے اعتراضات کو سن سن کر کے ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ صبر کے ساتھ سنتا رہا اور ایک بھی بات ان واقعات کے متعلق جو میرے ہندوستان سے چلے آنے کے باعث ہوئے نہیں نکالا۔ مگر اب بہتر ۷۲ برس کے سن میں، جب میرے پاؤں کے نیچے میری قبر ہے۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ان واقعات کو بلا کم و کاست خدا کو حاضر و ناظر جان کر لکھ جاؤں۔"

چنانچہ ۲۳ مارچ ۴۰ کی قرارداد پاکستان کے مرتبین کی فہرست سے اپنی قطعی بریت و لاتعلقی کے ثبوت کے طور پر موصوف نے لکھا:۔

"...... ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو تین بجے لاہور پہنچا۔ جس وقت میں مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں پہنچا تو نواب چھتاری اور سر سلطان احمد مجھے فوراً اپنے ساتھ باہر لے گئے اور کہا کہ لیگ کے ریزولیوشن میں بہت سی خامیاں ہیں لہٰذا آپ اِن کے متعلق اجلاس میں کچھ کہیں۔ میں نے کہا میں نے تو ابھی تک ریزولیوشن پڑھا بھی نہیں ہے۔ میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ لوگ اندر چلیں اور آپ کو جو کچھ کہنا ہے کہیں۔ میں یہ گفتگو کر کے اندر آیا تو ریزولیوشن پاس ہو چکا تھا ــــــ!

...... رات کو میں نے مسلم لیگ کا ریزولیوشن جو دن میں پاس ہو چکا تھا غور سے پڑھا اور میری حیرت

کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس تجویز میں صوبوں کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ صرف شمال اور مشرق کے مسلم اکثریت کے زونوں (ZONES) یا حصّوں میں اقطاع کے لین دین کے ساتھ آزاد حکومت کے بنائے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔!

قراردادِ پاکستان کے پیراگراف (۳) کی عبارت یوں تھی:۔

"تجویز ہوا کہ مسلم لیگ کی یہ غور شدہ رائے ہے کہ کوئی دستوری اسکیم ملک میں مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگی جو حسبِ ذیل بنیاد پر قائم نہ ہو یعنی وہ جغرافیائی ہمسائے (اقطاع یا اکائیاں) UNITS ریجن یا زون ZOONS حسبِ ضرورت اقطاع کے لین دین کے ساتھ (گویا جہاں جیسی ضرورت محسوس ہو کاٹ چھانٹ کر کے)[1] اس طریقے سے شامل کیے جائیں کہ وہ تمام حصّے جن میں عددی اعتبار سے مسلمان اکثریت میں ہوں۔ جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصّے ہیں ان کو ملا کر آزاد اسٹیٹس بنائی جائیں جو خودمختار اور آزاد ہوں۔۔۔"[2]

ریزولیوشن کے پیراگراف (۴) میں، جس میں کہا گیا تھا کہ "یہ

---

(1) "SUBJECT TO SUCH TERRITORIAL ADJUSTMENTS – AS MAY BE FOUND NECESSARY."

(۲) اصل قرارداد کے نمبر (۳) کے مندرجات کی نسبت چودھری خلیق الزماں صاحب کی اپنی تحریر کردہ کتاب "شاہراہِ پاکستان" میں وضاحت و صراحت۔

اجلاس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ ان ہی بنیادی اصولوں کے مطابق ایک دستور مرتب کرے جس میں بالآخر تمام اختیارات جیسے دفاع۔ امورِ خارجہ۔ مواصلات کسٹم اور دیگر ایسے ضروری شعبہ جات ہوں وہ ان حکومتوں کو حاصل ہوں" کی چودھری صاحب نے سخت مخالفت کی اور کہا کہ :۔

یہ وہ تجاویز ہیں جو مسلم لیگ نے اگسٹ ۱۹۳۹ سے ۳ر فروری ۱۹۴۰ء تک کے ایسے متحدہ ہندوستان کے لیے وضع کی تھیں جس سے ذہنی چھٹکارہ مشکل تھا۔ لیکن اب جب کہ طے کر لیا گیا تھا کہ "متحدہ ہندوستان" سے "پاکستان" کی شکل میں مکمل طور پر چھٹکارہ پالیا جائے تو کونسل کا یہ بنیادی فرض تھا کہ اپنے ماضی کے ہراس تصور سے قطع تعلق کر لیتی جس کا یہاں غیر ضروری اظہار کیا گیا تھا اس طرح یہ ایک مضحکہ خیز دستاویز بن جاتی ہے"۔

آگے چل کر لکھا کہ :۔

"مدعا کو صاف صاف بیان کرنا چاہیے تھا کہ "مسلم لیگ شمال مغربی ہند میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں کی ایک وفاقی ریاست "FEDERAL STATE" جو کلیتاً خود مختار و آزاد ہوگی بنانا چاہتی ہے اور اسی طرح یہ مطالبہ کرتی ہے کہ مشرقی ہند میں صوبۂ بنگال اور صوبہ آسام کی ایک خود مختار فیڈرل اسٹیٹ قائم کی جائے"۔

"**مگر** مقامِ حیرت ہے" چودھری صاحب نے لکھا "کہ اس ساری قرارداد میں لفظ "صوبہ" سے اس قدر احتراز کیا گیا ہے کہ کہیں ایک جگہ بھی یہ لفظ استعمال

نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس ایسے ذو معنی اور غیر متعین الفاظ جیسے "ریجن" اور "زون" ZONES بار بار استعمال کیئے گئے ہیں ......

شاید اس لیے کہ صوبہ کے لفظ کے ساتھ، بڑے بڑے اقطاع کے، لین دین کے الفاظ کھپ نہیں سکتے تھے۔

"TERRITORIAL RE ADJUSTMENTS"

کے استعمال کی معنویت یا خطرناک نتائج چاہے اُس وقت مرتبین کے ذہن میں نہ ہوں، بہرحال اِن الفاظ نے ہندو انڈیا کو یہ پرمٹ دے دیا کہ بھئی، جس وقت تمہارا جی چاہے اسی کو بنیاد بنا کر پنجاب اور بنگال وغیرہ کی تقسیم کا دعویٰ کر دینا۔ نتیجہ یہ کہ چار کروڑ کی مسلم اقلیت ہندو ہندوستان کے کروڑہا ہندو اکثریت کے نرغے میں پھنس گئی اور جب وقت آیا تو انھیں بھاگ نکلنے کا راستہ بھی نہ مل سکا:

"میں، آج (۲۶) برس قبل کے اس ریزولیوشن کے الفاظ کو غور سے پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم چلے تھے کُل پنجاب کا دعویٰ کرنے اور ہم نے اپنے عومی دعویٰ ہی میں اپنا پچاس فیصد دعویٰ قلمزد کر دیا۔ میری وہ رات بڑی بے چینی سے گزری مگر میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ اگر اس وقت میں کوئی صورتِ اختلاف اٹھاتا ہوں تو مجھے کامیابی ہو یا ناکامیابی، بہر نوع مسلم لیگ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور پھر شائد

اتنا بھی؛ جو اس تحریک میں مانگا گیا ہے ہم کو نہ مل سکے
لہٰذا وقت اور موقعہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔ شاید کہ کوئی
ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے ہم کو اس تجویز سے
چھٹکارہ مل سکے۔" "اور اس طرح جب تقسیم ہوئی"
چودہری صاحب نے لکھا۔ "ہمیں کٹا پٹا پاکستان بھی
نہیں ——— "پاستان" ملا کیوں کہ کشمیر کا
"ک" انڈیا کو گیا ——— "!

اور آج بھی چودہری صاحب کی یہ دلیل محتاجِ دلیل ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ——— ایک ذرا سی وقتی مصلحت کی خاطر انھوں نے "بلیک وارنٹ" پر انگوٹھا کیسے لگا دیا۔ (۲۶) سال بعد ——— (۷۲) سال کی عمر کو پہنچنے پر جب اُن کی عزت و شہرت تختۂ دار پر اور زندگی بسترِ مرگ پر پہنچ گئی تو انھیں وہ **فرض** یاد آیا جو اگر (۲۶) سال پہلے ۲۲، ۲۳ مارچ کو یاد آجاتا تو بقول ان کے اتنی تباہی نہ مچتی ——— ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا۔ "زمن شناسی" کی ایسی دیر آید مثال کی شائد ہی دُنیا میں کہیں اور مثال مل سکے ——— !

چنانچہ "SUBJECT TO SUCH TERRITORIAL ADJESTMENTS —— AS MAY BE FOUND NECESSARY."

کی تخریبی ترمیمی پیشکش کا ذکر کرتے ہوئے سرکردہ مسلم لیگی لیڈر جناب پیر علی محمد راشدی نے لکھا:۔

" میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ قرارداد کے

ابتدائی مسودے میں ایک کمی رہ گئی تھی، جس کو میں نے
آخری وقت پر ایک چھوٹی سی ترمیم پیش کر کے سبجکٹ
کمیٹی کی سٹیج پر پورا کروا لیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے
ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ ترمیم والی پرچی مسلم لیگ کے کاغذات
میں دیکھی گئی ہے جو اس وقت جامعہ کراچی کی تحویل میں
ہیں۔ ترمیم کا مضمون تھا۔

"SUBJECT TO SUCH TERRITORIAL ADJESTMENTS—AS MAY BE FOUND NECESSARY."

اس ترمیم کا پس منظر یہ تھا کہ پاکستان کی فزیبلیٹی رپورٹ FEASIBILITY REPORT کے سلسلے میں تحقیق کے دوران محسوس کیا گیا تھا کہ اس وقت کے مسلم میجارٹی والے صوبوں کے علاوہ مزید علاقے بھی پاکستان کو ملنے چاہئیں۔ مثلاً سارا راجپوتانہ، پنجاب کی ریاستیں، صوبہ بہار کے کچھ اضلاع، دہلی آگرہ (ہو سکے تو یو پی سے بھی کاریڈور) مجوزہ پاکستان کی حدود کے اندر لانے چاہئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی مسلم آبادی کو تحفظ دیا جا سکے اور آبادی کے تبادلے کا سوال پیدا نہ ہو۔ جن علاقوں کو ہم نے **پہلے سے فرض** کر لیا تھا۔ وہ صوبہ آسام، صوبہ متحدہ بنگال (اضافی علاقوں کے ساتھ) صوبہ متحدہ پنجاب، صوبہ سرحد، اور صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان، کشمیر اور کچھ ریاستیں۔

اب ان اضافی علاقوں کو پاکستان کی حدود میں لانے کے لیے قرارداد میں گنجائش رکھنی تھی جس کا انتظام اس ترمیم کے ذریعے کروا لیا گیا تاکہ ——— "آید بکار"۔
اس وقت قائداعظم نے ترمیم دیکھتے ہی بغیر بحث، اس کو اصل مسودے میں داخل فرما دیا۔ غالباً جناب پیرزادہ[1] صاحب نے بھی میری لکھی ہوئی کاغذ کی وہ سلپ دیکھ لی

---

(1) جناب شریف الدین پیرزادہ۔ قائداعظم کے معتمد، ماہر قانون۔ ایڈووکیٹ

تھی۔ ...... ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو یہ مسودہ بصورت قرارداد پاکستان، لاہور سیشن نے منظور کر لیا۔ (میں پھر عرض کرتا ہوں کہ یہ مسودہ حضرت قائداعظم نے خود تحریر فرمایا)[(۱)] اس "پہلے سے فرض کر لیا تھا" کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ مطالبۂ پاکستان کی قرارداد نہ ہوئی علم مساحت کا کوئی جواب ہوا کہ "فرض کیا کہ لا کی قیمت ——— ہے"۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ لیاقت علی خان نے بھی یقین کر لیا کہ کانگریس بھی ریاضی کے اس بندھے ہوئے فارمولے کے خلاف نہیں جا سکے گی۔ شائد وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ہندو بنیا مساحتی "فرض" سے کہیں زیادہ "کوڑی" سے دلچسپی رکھتا ہے۔

حیرت ہے، انھیں دم آخر "ہل من مزید" کا یہ نسخہ تو نظر آیا لیکن قرارداد کے سارے مسودے میں لفظ "صوبہ یا صوبہ جات" کا الحرافی شہتیر کہیں دکھائی نہیں دیا! نتیجہ یہ کہ اس "ترمیم" نے ایک طرف قرارداد کو فائنل کر کے مطالبہ کو حتمی شکل دیدی تو دوسری طرف "دستوری موشگافی" کے سارے راستے بھی قائد کے لیے اس طرح بند کر دیئے کہ ۹ر اپریل ۱۹۴۶ء کی لیگ کنونشن دہلی کی قرارداد تشریح بھی بے اثر ہو گئی۔[(۲)] آخر ایک دن وہ بھی آ گیا کہ بہ تصرف مصرعہ "اس مطالبہ کو آگ لگ گئی ترمیم راشدی سے"۔ اور کانگریس نے "TERRITORIAL ADJUSTMENTS" ہی کے اُسترے سے قرارداد کا گلا کاٹ دیا۔ ——— شائد چودھری خلیق الزماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

---

(۱) شائع شدہ "مشرق و مغرب" قسط (۳) صفحہ (۳) کالم (۲) موقر جنگ، کراچی ۔ ۴ر جنوری ۱۹۸۲ء

(۲) قرارداد پاکستان کی مزید تشریح مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز کے منتخب ارکان کی اس لیگ کنونشن کی ایک قرارداد میں متفقہ طور پر کی گئی جو قائداعظم کی صدارت میں ۹ر اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں منعقد ہوئی جس میں من جملہ دیگر امور متعلقہ کے یہ واضح کیا گیا کہ:۔

"ہندوستان کے شمال مشرق میں، بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان یعنی پاکستان کے علاقے جہاں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے، وہاں واحد مقتدر آزاد مملکت کی تشکیل کی جائے اور اس امر کا واضح اعلان کیا جائے کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا۔"

"ایک بڑی مصیبت لیگ کی یہ تھی کہ اس کے اکثر نمائندے
کل ہند سیاست سے بالکل بے بہرہ اور ناواقف تھے
جن کو اپنی زندگیوں میں سوائے صوبائی معاملات کے
ہندوستان کے بڑے سیاسی مسائل کا کوئی جیتا جاگتا
تجربہ نہ تھا۔ نہ انھوں نے انگریزوں سے ٹکر لی تھی نہ کبھی
کانگریسی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ جناح
صاحب کی لیڈری کو وہ اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں
کا کفارہ سمجھتے تھے جس سے وہ اپنے آپ کو کم اور جناح
صاحب کو زیادہ نقصان پہنچا رہے تھے۔"

چنانچہ، جناح صاحب کو جو نقصان پہنچا اُس سے "دانا دشمن" کی
افادیت ایک بار پھر واضح ہو جاتی ہے ——— !

چنانچہ چودھری صاحب نے "آید بکار" کے پہلے لفظ کو بلا سوچے داخل
"حرم" کر لینے پر لکھا کہ :۔

"یہ تجویز ایک سبجکٹ کمیٹی سے پاس ہو کر کونسل میں
آئی تھی، خدا معلوم اس کو سبجکٹ کمیٹی میں سر سکندر
حیات[1] اور مسٹر جناح نے کیسے منظور کر لیا۔

پانچ ماہ بعد ——— برطانوی حکومت کی جانب سے ۸ر اگست
۱۹۴۰ء کو وائسرائے ہند نے ایک اہم بیان شائع کیا جس کے پیراگراف (۲) میں تیقن
دیا گیا تھا کہ :۔

---

(۱) سر سکندر حیات کی حیات ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو ختم ہو گئی۔ عمر (۵۷) سال۔

(۲) "اس شک کو اقلیتوں کو کسی آئندہ کے دستور میں کافی تحفظات نہ ہوں گے کو دور کرنے کے لیے برٹش گورنمنٹ اعادہ کرتی ہے کہ حکومت، امن اور ہندوستان کی بہبود کی ذمہ داریاں کسی ایسی طرز کی گورنمنٹ کو منتقل نہیں کر سکتی جس کے اقتدار اور اختیارات کے واضح طور پر ہندوستان کی قومی زندگی میں بڑے اور باوقار عنصر مخالف ہوں اور نہ حکومت ایسے عناصر کو ایسی حکومتوں کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کرے گی۔" (۱)

یہ ایک خوش آئند اعلان تھا جس کی رو سے مسلم لیگ کو اپنے ۲۳ مارچ کے ریزولیوشن کی خامیوں کے باوجود اس بات کا تیقن حاصل ہو گیا کہ جب تک وہ رضامند نہیں ہو گی ہندو ہندوستان میں اپنی بھاری اکثریت کے باوجود کسی طور بھی یکطرفہ اقتدار پر قبضہ حاصل نہیں کر سکے گا اور مسلم لیگ حالات کے لحاظ سے سودے بازی کی پوزیشن میں ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مزید علاقہ جات کے حصول کے ساتھ اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کر سکے جو ۲۳ مارچ کی قرارداد کی رو سے سالم صوبہ جات کے عدم اندراج سے سرزد ہوئی تھی۔

غالباً چودھری صاحب کی طرح مسٹر اے۔ کے فضل الحق نے بھی بہت بعد میں "پاکستان ریزولیوشن" کی بغور تلاوت کی تھی۔ بار بار پڑھنے کے باوجود وہ ریزولیوشن کے پیراگراف (ب) کے درمیانی حصے کو جو محض ایک سفارش کا درجہ رکھتی تھی

---

(۱) "وزارتی مشن کے دورۂ ہند" کے موقعہ پر قائد نے اپنے بیان مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۴۶ء کو جسے "ٹرانسفر آف پاور" جلد (۷) کے صفحہ (۶۶۳) پر ریکارڈ کیا گیا ہے "مسلم لیگ کی پوزیشن کے فقرہ (۴) میں برطانوی پارلیمنٹ کے اس حتمی تیقن کا حوالہ دیا ہے۔ ریکارڈ آفس کا نمبر L/P & J/5/337: PP. 343 - 9 ہے۔

"مساوی علاقائی دباؤ" کے معنی نہیں پہنا سکے جس میں کہا گیا تھا کہ :-

"اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں حسب ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات اُن کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے اُن کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں "

اور جس کے سبب مرتب و محرکین تحریک خوش تھے کہ اگر ہندو ہندوستان میں مسلمانوں کو دبایا گیا تو ہم بھی یہاں "اقلیتوں" کا کچومر نکال دیں گے۔ مطالب و مفہوم قرارداد سے تو چودھری صاحب کے صرف رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے لیکن قارئ قرارداد فضل الحق کے تو سر کے بال بھی کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے عوز کیا کہ "قطعاً" کے "لین دین" کے بعد پنجاب، بنگال اور آسام میں جو کچھ ہاتھ آئے گا اس پر "گنا دیکر دارہ لینے" کی مثال صادق آجائے گی اور ایسا ہوا ——— اور یقیناً ہوگا تو پھر اس بھاری مسلم اکثریت کا کیا ہوگا۔ جو مجوزہ پنجاب مغربی بنگال اور آسام میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی اور جن کی ہر تکلیف اور اتلاف جان و آبرو کے لیے یہ بحیثیت مسلم نمائندہ و سابق وزیر اعلیٰ متحدہ بنگال اور قارئ قرارداد ذمہ دار ہوں گے؟

چنانچہ ۸ ستمبر ۱۹۴۱ء کو وائسرائے کی "ڈیفنس کونسل" سے استعفیٰ کو "صدر مسلم لیگ کا غیر آئینی دباؤ" قرار دیتے ہوئے انھوں نے بڑے سخت الفاظ میں صدر مسلم لیگ کو اپنا استعفیٰ پیش کیا۔ مستعفی ہونے کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے الزام لگایا کہ :-

(۱) —" یہ کہ پریسیڈنٹ، کا ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ طلب کرنا بالکل ناجائز تھا

(۲) ــ ورکنگ کمیٹی نے پریسیڈنٹ کونسل کے اقدام کو مجبوراً قبول کر لیا تھا کیوں کہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اگر وہ پریسیڈنٹ کے اقدام کی توثیق نہ کرتی تو یہ امر ان پر عدم اعتماد کا مظہر ہوتا جس کے لیے ورکنگ کمیٹی تیار نہ تھی۔

(۳) ــ اُنھوں نے اس امر پر سخت احتجاج کیا کہ پنجاب اور بنگال کے مفاد کو "اقلیتی صوبوں کے مسلمان" خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

(۴) ــ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر، اُن عظیم ذمہ داریوں کو، جو ان پر عائد ہوتی ہیں، معقول اور دستوری نظام کے تحت، ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں

(۵) ــ یہ کہ تمام جمہوری اصولوں کو، ایک شخص واحد کی، خود مختارانہ اور جابرانہ ذہنیت کی خاطر، بنگال کے (۳) کروڑ (۳۰) لاکھ مسلمانوں کے مفاد کو جو ہندوستانی سیاست میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں، قربان کیا جا رہا ہے"۔
(بعد میں مسٹر فضل الحق نے اپنا یہ استعفیٰ واپس لے لیا)

شاہ راہ پاکستان ص ۸۳۷

قرارداد پاکستان نے جب کانگریسی غبارے کی ہوا نکال دی تو گاندھی جی عرصے تک خالی جھلی کو دیکھتے رہے، شائد کہ کوئی "چمتکار" دیکھ سکیں۔ اُن کے لیے یہ تصور ہی رُوح فرسا تھا کہ "پوتر گاؤ ماتا" کو پاکستانی بیل دھکے مارتا پھرے۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بابو راجندر پرشاد سے بیان دلوا دیا کہ "کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں تجویزِ پاکستان پر غور نہیں کیا گیا کیوں کہ مسٹر جناح نے ہمیں اس پر غور و بحث کرنے کے لیے نہیں کہا تھا" ــــــ!

قائد نے ۱۹۴۱ء کے مدراس سیشن میں اس پر یوں تبصرہ کیا:۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے تجویزِ پاکستان

پر بحث نہیں کی ہوگی - ؟ یہ چھلاوہ، یہ سایہ ـــــــــ

یہ آسیب تو مارچ ۱۹۴۰ء سے ان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کا ہر لیڈر اور اُن کے رہنما مسٹر گاندھی، پاکستان پر بحث کر چکے ہیں۔ انھوں نے بیانات شائع کیے ہیں۔ دفتروں پر دفتر لکھے ہیں۔ خود بابو راجندر پرشاد نے ایک مختصر کتاب لکھی ہے۔ میں بابو صاحب سے کہتا ہوں کہ اس کے باوجود اگر انھوں نے تجویز پاکستان پر بحث نہیں کی تو اب کر لیں اور صرف بحث ہی نہ کریں اس پر ذہن لڑائیں۔"

"**بعد** از جنگ درجۂ نوآبادیات" کا مشن لیکر برطانوی وزیر سر اسٹفورڈ کرپس ۲۳ مارچ ۴۲ء کو دہلی پہنچے۔ دہلی پہنچنے کے فوری بعد کرپس نے برطانوی منصوبے کا اعلان کیا جس کی ضمن یہاں قابلِ غور ہے :-

C. سلطنت برطانیہ، اس دستور کو قبول کر لے گی جو دستور ساز اسمبلی بنائے گی، اس شرط کے ساتھ کہ برٹش انڈیا کا کوئی صوبہ اگر اس دستور کو قبول نہ کرے اور اپنی موجودہ حیثیت قائم رکھنا چاہے تو دستور میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ ایسے صوبے کے لیے بعد میں شرکت کا انتظام ہو سکے۔ ایسے نہ شریک ہونے والے لوگوں کے لیے اگر وہ چاہیں، تو، برٹش گورنمنٹ تیار ہوگی کہ ایک متحدہ کانسٹی ٹیوشن دے جس میں، وہی اختیارات ہوں گے جو انڈین یونین کو حاصل ہوں گے اور انہیں طریقوں سے

ان کو دیئے جائیں گے۔"

سر اسٹیفورڈ کرپس کی اس پیش کردہ تجویز کے متعلق قائد اعظم نے دلی میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے طویل اجلاس میں غور کرنے کے بعد سر اسٹیفورڈ کرپس کو خط لکھ کر وضاحت چاہی کہ:۔

"وہ صوبے جو انڈین یونین سے علیحدہ رہنا چاہتے ہوں وہ اپنی رائے کا کس طرح اظہار کریں؟"

سر کرپس نے ۲ اپریل ۴۲ء کو جواب دیا کہ:۔

(۱) اگر کوئی صوبہ اپنی کونسل کے (۶۰) فیصد ووٹ علیحدگی کے لیے حاصل کرے تو وہ انڈین یونین سے الگ رہ سکے گا

اور

(۲) اگر صوبے میں صرف (۵۱) فیصد ووٹ علیحدگی کے لیے آئیں تو اس حالت میں صوبے کی عام رائے شماری سے فیصلہ کیا جائے گا۔"

"اس خط کا جب مجھے الہ آباد میں علم ہوا۔" چودھری صاحب نے لکھا۔ "تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ اس عام رائے شماری سے ہم کو پورا پنجاب اور پورا بنگال بلا کسی تقسیم کے مل سکتا تھا۔"

چودھری صاحب کا خیال صحیح تھا جب کہ ۱۹۴۱ء کی تازہ ترین مردم شماری کے مطابق مشرق و مغرب میں ہندو مسلم تناسب آبادی یوں تھا۔

	MUSLIM	NON MUSLIM
PUNJAB.	1,62,17,248	1,22,01,577
N.W.F.P.	27,88,797	2,49,270
SIND.	32,08,325	13,26,683
Br. BALUCHISTAN.	4,38,930	62,701
	2,26,53,294	1,38,40,231
	62.07%	37.93%

NORTH EASTERN AREA.

	MUSLIM	NON MUSLIM
BENGAL.	3,30,05,434	2,73,01,191
ASSAM.	34,42,479	67,62,254
	3,64,47,913	3,40,63,345
	51.69%	48.31%

ALL POPULATION FIGURS IN THIS STATMENT ARE FROM THE MOST RECENT CENSUS TAKEN IN 1941:

(WAVELL, THE VICEROY'S JOURANL)
PAGE, 472, 73, APPENDIX II
Republished in Pakistan 1974)
(And also See)

"THE TRANSFER OF POWER" Vol VII. PP. 584
FIRST PUBLISHED, IN 1977. by,

"HER MAJESTY'S STATIONERY OFFICE, London.

یعنی :-

پنجاب :- ایک کروڑ باسٹھ لاکھ مسلم تو
ایک کروڑ بائیس لاکھ ہندو اور سکھ۔
مجموعی حیثیت میں چالیس لاکھ مسلم اکثریت کا صوبہ۔

بنگال :- تین کروڑ تیس لاکھ مسلم تو
دو کروڑ بہتر لاکھ ہندو
مجموعی حیثیت میں ستاون لاکھ مسلم اکثریت کا صوبہ۔

مسلم لیگ کے رجحان کو محسوس کرتے ہوئے مہاتماجی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک بار پھر انھوں نے اپنی بکری سے مشورہ کیا۔ بکری نے عرض کی "تیرے دیوتا بے حس و حرکت بت، تیری دھرتی ماتا پامال تو گئو ماتا بے زبان ہے۔ ایک تو ہی حیوانِ ناطق ہونے کے سبب ہندو جاتی کا مہاتما بن گیا ہے۔ جناح سے محتاط رہ۔ خطرناک آدمی ہے، کہیں باتوں باتوں میں ۲۳ مارچ کی قرارداد سے آگے نہ نکل جائے"

"باپو" کی کھوپڑی جھنجھنا گئی۔ تجویز رد کرنے میں مصلحت نہ دیکھ کر "خو بدرا بہانہ بسیار"، ہی کی آڑ میں انھیں عافیت نظر آئی۔ چنانچہ مشن کی پیش کردہ اچھی خاصی تجاویز کو رد کرتے ہوئے مہاتما نے سر کرپس سے کہا کہ "بعد از جنگ آزادی ہند کی یہ پیشکش ایک ایسے دیوالیہ ہوتے بنک کے چیک کی شکل میں ہے جس پر بہت آگے کی تاریخ پڑی ہو"۔

"A POST DATED CHEQUE ON A CRASHING BANK"

پورے طور پر کانگریسی رجحان رکھنے کے باوجود سر کرپس مسٹر گاندھی کا منھ دیکھتے رہ گئے اور وفد ناکام لوٹ گیا۔

کانگریس کے عدم تعاون اور وائسرائے ہند لارڈ ویول کی قلابازی کے سبب "کرپس مشن" کی ناکام واپسی کے بعد ہندوستان کی "بدلتی صورتِ حال" پر گاندھی کی بغاوت اور ہٹ دھرمی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انڈر سیکرٹری ہند اور دیگر ممبران پارلیمنٹ نے مسلم دشمنی میں عمداً صرف قرارداد اور مطالبۂ پاکستان ہی کو نشانہ بنایا۔ چنانچہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۲ء کو پارلیمانی بحث کے دوران مسٹر ہیو اونیل انڈر سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے کہا!۔

India Debate. 18 April, 1942
The Under Secretary of State for India (Sir Hugh O'Neill)
"I now come to the resolution of the All-India Muslim League. His Majesty's government view with regret the proposals which are put forward for dividing India into regions where the Muslims are in the majority. Quite apart from its abvious practical difficulties, if such a project were ever to be realised, it would shatter completely the whole concept of India Unity which has been gradually and laboriously built up by the British system of government over a long period of years, and which may be said to have attained its climax in the proposals for an All-India Federation in the act of 1935. We should view with misgivings any tendency to upset this conception of Indian Unity, and we can only regard it as a counsel of despair. I should be loathe to believe that the position will not be modified as a result of further negotiations between the Muslims and the Hindus."

"اب میں آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد کی طرف آتا ہوں۔ ملک معظم کی حکومت ان تجاویز پر افسوس کا اظہار کرتی ہے جن کا مقصد مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل الگ ریاست کا قیام ہے۔ اس کی تجویز کی عملی مشکلات سے قطع نظر، اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوگیا تو

اس سے ہندوستان کی وحدت کا وہ تصور تباہ ہو جائے گا جو انگریز نے سالہا سال کی محنت سے قائم کیا ہے اور جس کا نقطۂ عروج ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی تجاویز میں نظر آتا ہے۔ ہندوستانی وحدت کے اس تصور کو درہم برہم کرنے کی ہر تجویز کو ہم شک وشبہ کی نظر سے دیکھیں گے اور ہم اسے مایوسی کی راہ قرار دیں گے۔ مجھے یہ سوچ کر افسوس ہوگا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذاکرات کے نتیجہ میں (مسلمانوں کی) پوزیشن پر نظر ثانی نہیں کی جائے گی۔")

تند و تیز بحث میں حصہ لیتے ہوئے مانچسٹر کے رکن پارلیمنٹ مسٹر ووڈ نے کہا:۔

Mr. Wedgwood (Manchester, Gorton); - What of the Molem scheme of Mr. Jinnah? I was glad to hear what the Under-Secretary said about it. At the moment when Europe is considering federation, when even America and the new world have been drawing together, when we find our own commonwealth drawing together more tenaciously than ever, it is perfectly hopeless to come forward with a proposal to divide India into sovereign states by race and religion, and it is well that it should be said plainly in this House that it will not find any support in this country.

"مجھے مسٹر جناح کی اسکیم کے بارے میں نائب وزیر ہند کے خیالات سُن کر خوشی ہوئی ہے۔ اس وقت جبکہ یورپ ایک فیڈریشن کے قیام کا سوچ رہا ہے، جب امریکہ اور نئی دنیا ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں، جب ہماری دولت مشترکہ قریب

اتحاد کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ بات انتہائی مایوسی کی ہے کہ کسی کی طرف سے ہندوستان کو مذہبی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی جائے۔ یہ بات بڑی پسندیدہ ہے کہ اس ایوان میں کھل کر یہ بات کہہ دی جائے کہ اس تجویز کو اس ملک میں کوئی تائید حاصل نہیں ہو گی۔")

مسٹر گراہم وائٹ نے یوں اظہار خیال کیا:۔

Mr. Graham White (Birkenhead, East). The proposal of Mr. Jinnah and the Muslim League has been called a policy of despair, and I think a truer word was never spoken. The idea of organising an independent Muslim community is a direct negation of what I have always understood about the aspirations not only of Hindus but of Muslims as well.

("مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی تجویز کو مایوسی کی پیداوار قرار دیا گیا ہے۔ میری رائے میں اس تجویز کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے۔ ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام میری رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی امنگوں اور خواہشات کے اس تصور کے منافی ہے جو میرے ذہن میں موجود ہے۔")

کیمبرج یونیورسٹی سے رُکنِ پارلیمنٹ مسٹر پک تھورن نے کہا:۔

Mr. Pickthorn (Cambridge University). I was very glad indeed that we had today an official and clear turning down of what may be called the Pakistan Propo-

sal. One of the leading liberals in India wrote to me a short time ago that he thought that things had got to such a stage of exacerbation, almost conflagration, between Muslims and Hindus in India that all we could do in that matter was that, when either side produced something which obviously would not do, we should firmly say, "You can not expect any help for this from here." He instanced Pakistan proposal particularly, and I am very glad indeed that that has now been done.

(''میں بہت خوش ہوں کہ آج ہم نے واضح طور پر اور سرکاری سطح پر پاکستان کے بارے میں تجویز کو مسترد کر دیا ہے۔ ہندوستان کی ایک ممتاز لبرل شخصیت نے حال ہی میں مجھے لکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان محاذ آرائی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ جب دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی کوئی ایسی تجویز پیش کرے جو ہمارے نزدیک نامناسب ہو تو ہمیں صاف کہہ دینا چاہیئے کہ اس ضمن میں ہم کوئی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس شخصیت نے بطورِ خاص پاکستان کے قیام کی تجویز کا حوالہ دیا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ ہماری حکومت نے وہی مؤقف اختیار کیا ہے جو اس شخصیت نے تجویز کیا تھا۔'')

ایک اور رُکن سر اسٹینلے ریڈ نے بھی نظریۂ پاکستان کی نائب وزیرِ ہند اور دیگر اراکین کی مخالفت کی تائید کرتے ہوئے کہا:۔

Sir Stanley Reed (Aylerbury) While this house must withhold any support to what has come to be called the Pakistan Movement,

having for its object the creation of a chain of independent Muslim States, stretching from the North West to the East, surely it is wise to analyse the causes which lie behind it.

("اس ایوان کو تحریک پاکستان کی ہر ممکن امداد کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستان میں آزاد ایسی مسلمان ریاستوں کا قیام ہے جو شمال مغرب سے شمال مشرق تک پھیلی ہوں گی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ان اسباب کا تجزیہ بھی کرنا چاہیے جو اس مطالبہ کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔")

جنگ کراچی۔ ۲۶ اگست ۱۹۸۷ء

جولائی ۴۲ میں، امریکی پریس کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے قائد نے پھر "دو قومی نظریہ" کا اعادہ کیا:۔

"ہم مسلمان ایک جداگانہ اور ممتاز قوم ہیں۔ ہماری تہذیب جدا ہے، تمدن جدا ہے، زبان جدا ہے اور ادب جدا۔ فنون (آرٹ) جدا ہیں اور طرزِ تعمیر جدا۔ اسماء جدا ہیں اور اصولِ تسمیہ جدا۔ قوانین جدا ہیں اور اخلاقی ضوابط جدا۔ شعورِ اقدار جدا ہے اور احساسِ تناسب جدا۔ رسوم جدا ہیں اور تقویم جدا۔ تاریخ جدا ہے اور روایات جدا۔ رجحانات جدا ہیں اور عزائم جدا۔ مختصر یہ کہ زندگی کے بارے میں ہمارا زاویۂ نظر بھی جدا ہے اور حاصلِ نظر بھی جدا۔ بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف کے مطابق، ہم بذاتِ خود ایک قوم ہیں۔" (۱)

---

(۱) "تحریکِ آزادی کی جھلکیاں"۔ جنگ کراچی۔ ۲۷ اگست ۱۹۸۷ء

دراصل ہندو ہندوستان تاریخ کے کسی دور میں کسی کے ساتھ مخلص نہیں رہا۔ جہاں اور جب بھی موقعہ ملا اس گربہ مسکین نے شیواجی کے روپ میں افضل خان کو ہلاک کیا ہے۔ چنانچہ جاپانیوں کی طوفانی یلغار سے حوصلہ پاکر سوباش چندر بوس نے "آزاد ہند فوج" I.N.A. کی بنا ڈالی اور فرار ہو کر جاپانی کیمپ میں جاگھسا اور جب کلکتہ اور شمالی سرکار کی بندرگاہ کوکناڈا پر پہلی بمباری ہوئی ہے، تو مہاتماجی نے اُسے "نیک شگون" جان کر اکیلے ہی "اکھنڈ بھارت" ہڑپ کر جانے کی آخری چال چلی۔ وائسرائے ہند لارڈ لن لیتھگو سے آغاز جنگ پر ملاقات کے دوران برطانوی پارلیمنٹ اور ویسٹ منسٹر ایبے کی تباہی کے تصور پر رُو رُو کر اپنے تعاون کا یقین دلا کر یہ کہنے والے مہاتما نے کہ "اگر برطانیہ ختم ہو گیا تو ہندوستان کی آزادی کا کیا فائدہ؟" اپنے "عدم تشدد" اور "آہنسا" کا انگریزوں کو بھی کرشمہ دکھلاتے ہوئے ۸ راگسٹ ۱۹۴۲ء کی "شبھ گھڑی" میں کانگریسیوں کو ملک میں عام تباہی اور بربادی پھیلانے کا حکم دیدیا۔ انگریز اپنی تباہیوں پر جلے۔ بیٹھے ہی تھے۔ اُنھوں نے اگلے دن ۹ راگست ۴۲ء کی صبح سویرے اس تسلا بازیاں لگانے والے مہاتمع کو معہ اہم کانگریسی مداریوں کے اُٹھا کے جیلوں میں بند کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے فسادات کی آگ کو سختی سے دبا دیا۔

اِسی دن، ۹ راگست ۴۲ء کو پنڈت نہرو کے "کل ہند نمائندہ بیان" کے جواب میں جس میں انہوں نے بڑی مکاری سے کانگریس کو مسلمانوں کی بھی جماعت ہونے کا تاثر دیا تھا قائد نے بمبئی سے تردیدی بیان جاری کیا۔

"پنڈت نہرو فرماتے ہیں کہ کانگریس آزادی اور عزت کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہے (گویا انڈیا کانگریس کی ملکیت ہے)

مگر یہ کہاں سے نے کہ اقوام ہندوستان کی آزادی کا سودا کیا جائے؟
ہم لوگوں کی یہ قطعی رائے ہے کہ بر عظیم کی آزادی کو تیزی سے اور
جلد تر حاصل کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ معاہدے کی صورت
میں پاکستان اسکیم کو تسلیم کر لیا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
اس میں عزت و ناموس کی قربانی کا مسئلہ کہاں سے بیچ میں آ
گیا۔ اگر ہندو انڈیا دس کروڑ مسلمانوں کا حق خود ارادی
تسلیم کرنے پر آمادہ ہے اور مسلمانوں کو اس مصنوعی اور غیر فطری
وحدت میں زبردستی جکڑ رکھنے کے اصرار سے باز آجائے تو
کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ لیکن اس نے اگر اپنا یہی طریقہ جاری
رکھا تو اس کے نتائج انتہائی ہولناک اور تباہ کن ہوں گے۔"

۴۲ ۱۹ء کی گرفتاری کی صدائے بازگشت جب لندن پہنچی تو مشہور برطانوی
صحافی مسٹر بیورلی نکلس BEVERLEY NICHOLS ہندوستان آئے
تاکہ چشم دید حالات سے اہل انگلستان کو واقف کرا سکیں۔ ۱۸ دسمبر ۴۲ء کو
ملاقات کے بعد قائد کی نسبت انھوں نے اپنی کتاب "فیصلۂ ہند"
("VERDICT ON INDIA") میں لکھا۔

"ایشیا کا یہ فرزند جلیل زندگی کی (۷۰) بہاریں دیکھ چکا ہے
لمبا، دبلا پتلا، خوش پوش اور خوش وضع۔ ریشم کا ایک
شاندار سوٹ زیب تن کیے۔ آنکھ پر MONOCLE
لگائے، گلے میں سخت کالر جو شدید گرمی کے موسم میں
بھی زیب گلو رہتا ہے، ایسا معلوم ہوا جیسے اسپین کے
قدیم شرفاء کا زندہ نمونہ سامنے ہے۔ سیاسی معاملات

میں پختہ کار مدبر گویا کوئی باوقار انسان سینٹ جیمز کلب میں بیٹھا مصروف ناؤ نوش ہے اور ٹی ٹیمپس[1] کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ میں نے مسٹر جناح کو ایشیاء کی اہم ترین ہستی قرار دیا ہے تاکہ آپ کی نگاہ تصور میں ایک واضح اور روشن تمثیل سامنے آجائے۔ ایک محدود مختصر عرصے میں ہندوستان دُنیا کا نازک ترین مسئلہ بننے والا ہے اور مسٹر جناح اس انقلاب آفریں دور کے ہیرو ثابت ہونگے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہیں جنگ کا رُخ موڑ سکتے ہیں۔ دس کروڑ مسلمان اُن کے ایک اشارۂ چشم پر سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ منزلت کسی اور کو اس ملک میں حاصل نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی یہ بات حاصل نہیں ہے اگر گاندھی جی رخصت ہو جائیں تو جواہر لعل اُن کے بنے بنائے جانشین موجود ہیں اور صرف وہی نہیں راجہ جی ہیں۔ ولبھ بھائی پٹیل ہیں۔ کئی آدمی ہیں۔ لیکن جناح کا جانشین کوئی نظر نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جناح پر لیگ کا خاتمہ ہے۔ لیگ ایک مضبوط اور مستحکم جماعت ہے۔ البتہ اس کے اقدام و عمل کی راہیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ یہ گاڑی پٹڑی سے اُتر بھی سکتی

(۱) جرمن چانسلر ایڈولف ہٹلر کے اُن آرٹیکلز کے مجموعہ کا نام جو اُس نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء کے دوران لکھے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ہے۔ یہ ایک نئی جنگ کی بنا ڈال سکتی ہے لیکن جب
تک جناح زندہ ہیں۔ مسلم لیگ نہ تباہ ہو سکتی ہے نہ
گڑھے میں گر سکتی ہے۔ آپ ملاحظہ فرمایئے کیوں کر
ایک دنیا اس ریشمی لباس اور یک رُخی عینک والے
آدمی کے ہاتھ میں ہے "

دورانِ گفتگو جب نکلیس نے پوچھا کہ " پاکستان میں مسلمانوں کی معاشی حالت اِن
کی موجودہ حالت سے بہتر ہوگی یا خراب ؟

تو قائد نے تیزی سے جواب دیا :۔

" یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ مسلمانوں کے لیے قومی
آزادی کی نعمت معاشی نقطۂ نظر سے لعنت ثابت ہوگی؟
بہر حال، کسی یورپین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تجویز پاکستان
کو معاشی نقطۂ نظر سے ناقابلِ عمل قرار دے۔ پہلی جنگِ عظیم
کے بعد جب یورپ کے بڑے بڑے " مدبروں " نے
اُس براعظم کے حصے بخرے کر کے اُس کا سیاسی نقشہ بدل
ڈالا تھا اُس وقت اُن کا علمِ اقتصادیات کہاں چلا گیا تھا؟
ورسیلز کے صلح نامہ "TREATY OF
VERSILLES" کی رُو سے یورپ کی جو نئی
سیاسی تقسیم کی گئی ہے وہ مصنوعی اور بے تکی سرحدوں
کا مضحکہ خیز مرقع ہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ جن لوگوں
نے خود اپنے براعظم کا نقشہ اس طرح بگاڑ دیا وہ آج
ہمیں اقتصادیات کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں "

چور جیل میں ہو تو اٹھائی گیرے کے مزے آجاتے ہیں، چنانچہ ایک ایسے وقت جب "انڈیا چھوڑ دو" تحریک کے نتیجے میں، کانگریسی نیتا" جیلوں میں بند اور ابوالکلام آزاد "غبارِ خاطر" کے لیے خطوط نویسی میں مشغول تھے۔ گاندھی جی کے چیلے اور ہندو مہا سبھا کے سیکرٹری راجا مہیش ور دیال نے اچانک اکتوبر ۴۲ء میں چودھری خلیق الزماں سے اُن کے گھر پر ملاقات کی اور لیاقت علی خان کے حوالے سے "نیشنل گورنمنٹ" کے قیام میں بھرپور تعاون پیش کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"اگر مسلم لیگ پنجاب کی تقسیم پر رضامند ہو جائے تو مہا سبھا لیگ کے ساتھ" نیشنل گورنمنٹ" بنانے راضی ہو گی۔ میں لیاقت علی خان سے مل چکا ہوں، وہ انبالہ ڈویژن چھوڑنے تیار ہیں۔ اب صرف جالندھر ڈویژن کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ اگر آپ اس کو چھوڑنے تیار ہوں تو پھر کوئی دقت نہیں رہ جائے گی اور یہ تقسیم تو آپ کے پاکستان ریزولیوشن کے بالکل مطابق ہو گی۔"

چودھری صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس پیش کش کی شدید مخالفت کرتے ہوئے ۱۹۴۱ء کی تازہ ترین مردم شماری کے حوالے سے جس میں پنجاب اور بنگال وغیرہ میں بھاری مسلم اکثریت ثابت ہو چکی تھی۔ انھوں نے ایک تفصیلی خط قائداعظم کو لکھا، اپنے خط کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے تحریر کیا کہ:۔

"سب سے پہلے اس خط میں، میں نے پنجاب اور بنگال کی آبادی کے اعداد و شمار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہم ان دونوں صوبوں میں اکثریت میں ہیں اور ہم کو کسی وقت رائے شماری سے کوئی خطرہ

نہیں ہو سکتا۔

اُردو زبان نے پنجاب میں ایسی حیثیت حاصل کرلی ہے کہ خود پنجابی، یوپی میں اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بنگال میں اُردو عام طور پر سمجھی جاتی ہے اور مشرقی پاکستان میں بھی لوگ شوق سے اُردو پڑھنے لگے ہیں۔ اگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہوئی تو اس لسانی اور کلچرل تعلقات کو صدمہ پہنچنا یقینی ہے۔

علاوہ ازیں بنگال کے بٹوارے میں ہم کو زیادہ سے زیادہ سلہٹ ڈویژن مل جائے گا۔ مگر اس کے عوض ہم کو بے پناہ نقصانات اُٹھانے ہوں گے۔ یعنی کلکتہ اور کلکتہ سے لیکر بہار تک سارے معدنیات کے ذخیرے، لوہا اور کوئلہ وغیرہ سب ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور پنجاب کے بٹوارے میں علاوہ اور نقصانات کے ہندوستان کو کشمیر کے لیے راستہ مل جائے گا۔ اب رہا بہار۔ یوپی سی پی۔ بمبئی۔ مدراس اور دوسری اقلیتوں کا مسئلہ وہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد طائرانِ قفس ہو جائیں گے کیوں کہ جو سرحد جمنا پر بننے والی تھی وہ لاہور تک محدود ہو جائے گی اور تین سو میل کا فصل جس میں ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں ہوں گے۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں کے لیے سخت مہلک ثابت ہو گا۔"

"یہ سب کچھ لکھنے کے بعد" ——— چودھری صاحب نے لکھا ———

"میں نے ان سے (قائداعظمؒ سے) استدعا کی کہ خدا کے لیے
آپ اِن اقلیتوں کو تباہی سے بچائیں اور کسی حالت میں
بھی یہ چھوٹا پاکستان قبول نہ کریں جو ممکن ہے آپ کو آسانی
سے مل جائے مگر اس میں آپ کو کروڑوں مسلمان اقلیتوں
کی جانی و روحانی قربانی دینی ہو گی۔" (۱)

"لیکن ——— چودھری صاحب نے کہا ——— میرے اس خط
کا جناح صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا!"

لارڈ لن لیتھگو کی واپسی کے بعد ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو وائی کاونٹ ویول کے وائسرائے و گورنر جنرل کی حیثیت سے وائسریگل لاج دہلی" میں قدم رکھنے کے بعد سر آغاخان پیلیس پونا میں "نظر بند" گاندھی جی پر "بگڑی سنبھال جنتر" کا گیانی دورہ پڑا۔ اچانک ہی "مہاتما" نے اپنی "پراتھنا" کے دوران آدرش دیا کہ وہ بھارت ورش کو داکششوں سے آزادی اور نجات دلانے کے لیے "مرن برت" (تا دمِ مرگ بھوک ہڑتال) رکھ رہے ہیں۔ پھر اس خیال سے کو سچ مچ سورگ باشی نہ ہو جائیں۔" باپو" نے نسخہ میں پھل پھلاری اور اپنی چہیتی ایڈورڈز بکری کے دودھ کی رعایت شامل کر لی تاکہ ملیچھ مسلم لیگ آرکسٹرا "خس کم شد، جہاں پاک" کی دھن نہ بجادے۔

چمتکار کام آیا۔ ویول کے مشورے پر برطانوی حکومت نے "مہاطمع" کو آزاد کر دیا اور "خیر سے بدھو گھر کو آئے" کا ورد کرتے ہوئے مہاتما جی ۱۹۴۴ء میں وردھا پہنچ گئے۔ پہلے تو لارڈ ویول نے سیاسی لان پر "مارکر" بننے کی کوشش کی پھر چرچل کی گھرکی پر بیان دیدیا کہ "یہ میں نہیں سمجھتا کہ فی الحال گفت و شنید یا کسی انتظامی اقدام سے ہندوستان کا مسئلہ حل ہو سکے گا" ۱۹۴۴ء میں کراچی میں تقریر کرتے ہوئے قائد نے "ہز ایکسیلینسی"

(۱) شاہراہِ پاکستان ص۸۵۸

کاڑپا انکار لیا۔

"برطانوی حکومت وہی پُرانا کھیل کھیل رہی ہے۔ اس کی تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم تو پاکستان کے خلاف نہیں ہیں۔ ہندو خلاف ہیں۔ ہندوؤں سے کہتی ہے کہ ہم تو اکھنڈ ہندوستان کے خلاف نہیں ہیں۔ مسلمان خلاف ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ویول نہر سویز کو مجبور کرنے سے پہلے اپنا ذہن بحیرۂ روم میں پھینک آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں نہیں سمجھتا کہ فی الحال گفت و شنید یا کسی انتظامی اقدام سے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل ہو سکے گا۔" دراصل یہ برطانوی حکومت کی پالیسی ہے جس پر لارڈ ویول عمل کر رہے ہیں اور یہ پالیسی برطانیہ کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مسٹر چرچل نے کہا تھا کہ "مجھے وزیرِ اعظم کا عہدہ اس لیے نہیں دیا گیا کہ میں سلطنتِ برطانیہ کا دیوالیہ نکال دوں"۔ میں کہتا ہوں کہ مجبوراً دیوالیہ نکالنے سے رضاکارانہ طور سے دیوالیہ نکال دینا بہتر ہے کیوں کہ برطانوی سلطنت کا دیوالیہ آخرکار نکل کر رہے گا خواہ انگریز اسے پسند کریں یا ناپسند کریں۔"

اگست ۴۴ء تک تو "مہاتما" اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ بالآخر ویول کے مشورے پر انھوں نے ستمبر ۱۹۴۴ء میں قائدِ اعظم سے گفتگو شروع کی۔

گاندھی ——— جناح کی یہ اہم ملاقاتیں ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائدِ اعظم کے اپنے بنگلے واقع ملابار ہلز (بمبئی) پر شروع ہوئیں جو اٹھارہ دنوں تک جاری رہیں

دونوں ایک دوسرے کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے تھے۔ طے ہوا کہ روزانہ گفتگو کے بعد دونوں تحریراً ایک دوسرے کو خط لکھ کر دن بھر کی گفتگو کا دہراؤ کرینگے اور ایک دوسرے کی تجویز کا جواب بھی دینگے۔

۲۴ اور ۲۵ ستمبر ۴۴ء کو "دوقومی نظریہ" کی تُوتُو میں میں" کے بعد بحث کا کچھ انداز بدلا اور تقسیم ہند کے عملی پہلوؤں پر گفتگو شروع ہوئی۔ ۲۴ ستمبر کی شام گھر واپس آکر گاندھی نے قائدِ اعظم کو ایک طویل خط لکھا۔ لُبِ لباب یہ تھا کہ اگر مسلم لیگ "گاندھی کا نظریہ" "دوقوم کے بجائے ایک ہی قوم کے دو خاندان" کے خاکے کی تجویز کردہ شرط قبول کرنے پر آمادہ ہو تو وہ کانگریس کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ تقسیم ہند کا مطالبہ تسلیم کرے۔ اُنھوں نے لکھا کہ :-

"میں تو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں دو یا دو سے زیادہ قومیں آباد ہیں، ہاں، اتنا ماننے کو تیار ہوں کہ ہندوستانی قوم ایک خاندان ہے۔ جو بہت سے افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے وہ مسلمان جو ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں بستے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی ہندوستان سے الگ ہو کر رہیں یہ علاقے بلوچستان۔ سندھ اور سرحد پر اور پنجاب۔ بنگال اور آسام کے اِن حصّوں پر مشتمل ہیں جہاں مسلمان دوسرے تمام فرقوں کی نسبت تعداد میں زیادہ ہیں۔"

جناح نے جواب میں لکھا :-

"اگر آپ کی یہ بات مان لی جائے تو اِن صوبوں کی موجودہ سرحدیں بری طرح مسخ ہو جائینگی اور وہ بالکل نکمے ہو کر

مسلمانوں کے ہاتھ آ جائیگے" (۱)

گویا "مہاتما" نے دوسرے الفاظ میں ۲۳ مارچ ۴۰ء کی "خود تیار کردہ قرارداد" اور "TERRITORIAL ADJUSTMENTS" کی قینچی سے تراشا ہوا لنگڑی پیپرمن جناح صاحب کے سامنے کر دی ـــــــــ! (۲)

ادھر ۲۰ جولائی ۴۵ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں ونسٹن چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کو شکست ہو گئی اور ـــــ اٹیلی کی لیبر حکومت نے زمام حکومت سنبھال لی۔ "کمتر نسل افراد" پر مشتمل بالآخر وہ حکومت آ ہی گئی جس کے دور حکومت میں عظیم برطانوی سلطنت کے آفتاب عظمت و اقتدار کے غروب ہونے اور ہندوستان پر سے برطانوی قبضے کے خاتمہ کی پیش گوئی ہیر ہٹلر نے اپنی مشہور عالم کتاب "میری جدوجہد" (MEIN KAMPF) میں کی تھی۔

"یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ انگلستان اپنے ہاتھ سے ہندوستان کی سونے کی چڑیا چھن جانے دے گا۔

انگلستان اُس وقت تک ایسا نہ ہونے دے گا جب تک

---

(۱) کتاب "گاندھی جناح گفتگو" صفحہ ۲۳۔ شائع کردہ سینٹرل آفس آف دی آل انڈیا مسلم لیگ دہلی۔ نومبر ۱۹۴۴ء۔

(۲) الفاظ "خود تیار کردہ قرارداد" بہ ذمہ داری و اعتماد جناب شریف الدین پیرزادہ وزیر قانون حکومت پاکستان اسٹیٹمنٹ دوران اجلاس نیشنل اسمبلی آف پاکستان (مجلس شوریٰ) ۱۷ جنوری ۱۹۸۲ء و سرکردہ مسلم لیگی لیڈر پیر علی محمد راشدی، شائع شدہ "مشرق و مغرب" "قسط (۲) صفحہ (۲) کالم (۳) موقر جنگ، کراچی ۲۲ جنوری ۱۹۸۲ء کہ "...... دوسرے روز ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا جہاں یہ اصول منظور کر کے فیصلہ کیا گیا کہ ان ہی خطوط پر آنے والے آل انڈیا مسلم لیگ سیشن میں (جو لاہور میں ۲۳ مارچ ۴۰ء کو ہو رہا تھا) پیش کرنے کے لیے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جائے۔ یہ مسودہ قائد اعظم نے خود تیار فرمایا اور تیار ہو جانے کے بعد اسے میرے حوالے کیا کہ میں لاہور جا کر سر سکندر حیات مرحوم کو دکھا لاؤں۔ مسودہ لیکر میں موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ مولانا غلام رسول مہر مرحوم اور شیخ محمد عالم مرحوم بھی تشریف لے گئے۔ وہاں مہر مقبول احمد پہلے ہی موجود تھے۔ مسودہ دیکھا گیا اور سر سکندر نے اُس کے مندرجات کو منظور کر لیا۔ میں نے واپس جا کر یہ بات بتا دی۔ یہ تھا اُس تاریخی قرارداد کا مسودہ جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے اجلاس میں مولوی فضل الحق مرحوم نے پیش کی اور بالاتفاق منظور ہو کر قرارداد پاکستان کہلائی ـــــــ اور اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے وہاں مینارۂ پاکستان بھی تعمیر ہوا ـــ"!

وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک اپنی سلطنت کو بچانے
کے لیے صرف نہ کر چکا ہو۔ ہندوستان پر انگلستان کا
قبضہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک کہ برطانوی
راج اپنی حکومت کے افسروں میں غیر نسل یا کمتر خون کے
عناصر داخل نہیں کر لیتا۔"

پہلی صورت میں برطانوی اقتدار کو نازی سواسٹکا کی گرفت سے بچانے کے
لیے ونسٹن چرچل نے آخری قطرہ خون تک خرچ دیا تو دوسری صورت میں کلیمنٹ اٹیلی
سمیت ساری کابینہ "کمتر خون" کے سبب "بین الاقوامی دباؤ" برداشت نہ کر سکی
یہاں تک کہ ذلت کے آخری درجے پر آ کر اس نے اس "کالے آدمی" کے آگے
ہتھیار ڈال دیئے جسے ڈربن جاتے ہوئے راستے میں ٹکٹ چیکر نے اتار لیا تھا۔

۱۹ مارچ ۴۶ء کو کانگریس کے زرخرید مُلّا و صدر مولانا آزاد کے ایک
بیان پر جس میں ہر پھیر کے قائداعظم کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ان کے "مہاتما"
اور توشۂ آخرت گاندھی جی کی بات مان لیں قائداعظم نے کہا:۔

"مولانا آزاد نے جس خلوص سے کانگریس کی خدمت کی ہے
اگر وہ اس سے نصف خلوص اور جوش کے ساتھ اللہ کی
عبادت کرتے تو آج معاشرے میں اُن کی حیثیت
دوسری ہوتی۔ مولانا کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی کے چند سال
سکون اور اطمینان سے اللہ کی عبادت میں گزاریں اور
کانگریس کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔"

ہندوستان کی مجلسِ دستور ساز کے جلد ہی منعقد ہونے والے
عام انتخابات کے "مخلوط طریقۂ انتخابات" کی شدید مخالفت کرتے ہوئے قائداعظم

نے نومبر ۱۹۴۵ء میں ایک واضح اور صاف پالیسی کا اعلان کیا:۔

"ہم ہندو اور مسلمان ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تاریخ میں، زبان میں، طرزِ تعمیر میں، موسیقی میں قانون اور اصولِ قانون میں، کھانے پینے میں، معاشرت میں، لباس میں غرض ہر چیز میں ہم ہندوؤں سے مختلف ہیں صرف ووٹ ڈالنے کی صندوقچی میں ہندو اور مسلمان یکجا نہیں ہو سکتے۔"

ہندوستانی رائے عامہ کے قائدین کے اشتراک کے ساتھ جلد سے جلد ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے ایک برطانوی وزارتی وفد جو سر اسٹیفورڈ کرپس، پریسیڈنٹ آف دی بورڈ آف ٹریڈ۔ لارڈ پیتھک لارنس، سیکرٹری فار انڈیا اے وی الگزنڈر، فرسٹ لارڈ آف دی ایڈمیرلٹی پر مشتمل تھا۔ ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان پہنچتے ہی وفد کے ایک رکن لارڈ پیتھک لارنس نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ:۔

"یہ درست ہے کہ کانگریس وسیع تعداد کی نمائندہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ درست نہ ہو گا کہ مسلم لیگ کو فقط ایک اقلیتی جماعت قرار دیا جائے۔ مسلم لیگ در حقیقت عظیم مسلم قوم کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہے۔"(۱)

۵ مئی ۱۹۴۶ء کو شملہ میں ایک بار پھر ہندوستانی قائدین کے اشتراک

---

(۱) کتاب "TRANSFER OF POWER." کی جلد (۷) کے صـ اور صـ پر "سوال و جواب" کو بالکل غائب کر دیا گیا ہے۔ منتخب دستاویزات میں شاید یہ "غیر منتخب" حصّہ تھا۔

کے ساتھ اجلاس منعقد ہوئے۔ کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور سردار سورن سنگھ شریک ہوئے تو مسلم لیگ کی جانب سے قائداعظم جناح۔ مسٹر لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر نے شرکت کی۔

مارچ ۱۹۴۶ء کے آخری ہفتے سے لیکر مئی کی ۱۵ تاریخ تک جب نمائندہ جماعتیں کسی قابل عمل فارمولے پر متفق نہ ہو سکیں تو ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے اپنا فارمولا پیش کر دیا جو آج بھی "A.B.C" پلان کے نام سے مشہور ہے۔ مشن نے تجویز پیش کی کہ:۔

(۱) جداگانہ انتخابات کے ذریعہ ایک دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے جس میں آبادی کے ہر دس لاکھ افراد پر ایک ممبر ہو اور اس اسمبلی کو متحدہ ہندوستان کا آئین بنانے کا کام تفویض کیا جائے اور

(۲) ہیئت سیاسیہ کی اس نئی تشکیل میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا اہتمام یوں ہو کہ برٹش انڈیا کے صوبوں کو اس طرح تین ٹکڑوں ا (GROUPS) گروپس میں تقسیم کر دیا جائے:۔

گروپ .A - مدراس۔ بمبئی۔ صوبہ متحدہ۔ بہار۔ صوبۂ متوسط اور اڑلیسہ (اس گروپ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے)

گروپ .B - پنجاب۔ صوبۂ سرحد اور سندھ (اس گروپ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے)

گروپ .C - بنگال اور آسام (مسلمانوں کی اکثریت کا وہ مشرقی حصہ جو ثابت ہے)

پلان کی منظوری کی صورت میں اس بات کی گنجائش ہو گی کہ اس منصوبے پر آئندہ دس سال بعد، اگر فریقین چاہیں، تو، نظر ثانی ہو سکے گی۔

مزید سفارش کی گئی کہ :-

(الف) ہر گروپ کا اپنا الگ آئین ہو۔

(ب) دفاع۔ امورِ خارجہ اور مواصلات مرکزی حکومت کے پاس ہوں اور

(ج) مرکزی امور کا انتظام، مرکزی حکومت کے پاس مشترک انتظام میں ہو۔[1]

اس کے علاوہ " پلان " پر عمل پیرا ہونے اور راہ ہموار کرنے کے لیے وزارتی مشن کی رائے میں یہ بے حد ضروری تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ پر مشتمل ایک ایسی " عبوری حکومت " ضرور ہونی چاہیئے جو مجوزہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں مددگار ہو اور اس طرح کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکے۔

یہ عبوری حکومت گویا " پلان " کی مشترکہ دستور ساز اسمبلی قائم ہونے تک برسر اقتدار رہتی۔ اس عبوری حکومت میں بھی مسلمانوں کے لیے خصوصی تحفظات فراہم کیے گئے تھے کہ " عبوری حکومت " میں اُسے کانگریس کے ساتھ برابری کا درجہ دیا جائے گا۔ چنانچہ ۳ رجون ۱۹۴۶ء کو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے (۱۲) رکنی کابینہ کی تشکیل میں عہدے پیش کیے۔

کانگریس	(۵)
مُسلم لیگ	(۵)
سکھ	(۱)
اچھوت	(۱)
	۱۲

---

(۱) یہ " فارمولا " بعینہٖ وہی ہے جو محترم مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۷ء میں پیش کیا تھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ تجویز اپنے نے اُردو میں پیش کی تھی اور اسے غیر نے انگریزی میں پیش کیا۔ غلام قوم کے غلام ذہن کے لیے یہ تسکین کیا کم ہے کہ حسرت کی " تجویز " انگریز کے منہ سے " فارمولا " بن گئی تھی!

۶ جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اجلاس میں کیبنٹ مشن کے اس منصوبے پر بڑی بحث ہوئی۔ صورتِ حال کے بارے میں چودھری خلیق الزماں نے لکھا :

"اجلاس کے دوران میں نے اس تناسب شرکت پر اعتراض کیا اور دلیل دی کہ اس "مساوی" تناسب کے باوجود ہم اس وقت "اقلیت" کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ جب "شیڈول" سیٹس کانگریس سے مل جائیں گی اور ایسا ہونا یقینی ہے کیوں کہ مذہبی حیثیت میں یہ لوگ بہرحال مسلمان پر ہندو کو ترجیح دیں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ اس طرح ہم بنگال آسام اور مغربی صوبائی اکثریتی صوبہ جات سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن قائد نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "خلیق! دو تین ماہ اس صورت کو جاری رہنے دو"۔ جب میں نے اپنے ہی اصرار پر اصرار کیا تو قائد میرا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف چلے گئے"۔۔۔۔۔۔!

بالآخر قائد کی ہدایت کے مطابق مشروطی بنیاد پر اسے قبول کر لیا گیا۔ ایک قرارداد میں اپنے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے کونسل نے کہا :

"آزاد اور خود مختار پاکستان کا حصول اب بھی مسلمانانِ ہند کا ناقابلِ تغیر مطمحِ نظر ہے جس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے وہ اپنے پاس موجود جملہ وسائل بروئے کار لائینگے اور اس کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرینگے۔ مشن کے منصوبے کی رو سے مسلم اکثریت کے چھ صوبوں کو ایک

علیحدہ "ذیلی وفاق" قائم کرنے کا حق ہوگا اور آگے چل
کر اس وفاق کی بنیاد پر آزاد اور خود مختار پاکستان کی
تشکیل ہو سکے گی"

۸ رجون ۴۶ء کو قائد نے وائسرائے ہند لارڈ ویول کو خط لکھ کر اپنے ساتھ
"عبوری حکومت" پر پہلے سے متفقہ اصولوں کی یاد دہانی کی جس میں کہا گیا تھا کہ
"عبوری حکومت" میں مختلف قومیتوں کی ترتیب پانچ پانچ اور دو ہوگی۔ قائد
نے انتباہ دیا کہ اس سے کسی قسم کی روگردانی مسلم لیگ کی طرف سے منصوبے کی منظوری کو
خطرے میں ڈال سکتی ہے۔[۱]

۱۹۳۰ء کے مقابلے میں ۱۹۴۱ء کی تازہ ترین مردم شماری کے
اعداد و شمار نے کانگریس پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ پورے صوبہ پنجاب اور
بنگال میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو گئی ہے اور اگر کانگریس
وزارتی مشن کے اس منصوبے کو کسی بھی عنوان سے منظور کر لیتی ہے تو گویا وہ مسلم لیگ
کے اپنے مطالبہ ۲۳ رمارچ ۴۰ء سے کہیں زیادہ علاقہ دے دیگی جس کا انھوں
نے غلطی سے "اضلاع" زون اور اکثریتی اقطاع کی نئی حد بندی کے ساتھ
"صوبہ" بنانے کی درخواست کی تھی۔ کانگریس نہیں چاہتی تھی کہ کسی طرح ۲۳ر
مارچ کا یہ آسیب جو الٹا لیگ کے پیچھے پڑ گیا ہے اس سے جان چھڑانے میں
خود ممد ثابت ہو۔ وزارتی مشن کی اس پیش کش سے کہ مشرق میں صوبہ بنگال
اور آسام کے مسلم اکثریتی علاقے اور مغرب میں سالم پنجاب اور ملحقہ صوبہ جات کے
اکثریتی مسلم علاقوں پر مشتمل دو طاقتور مسلم بلاک بنائے جائیں گے۔ کانگریس چونک

(۱) جناح کا خط بنام فیلڈ مارشل ویول
L/P&J/5/337: PP. 466–8. DATED JUNE 19th 1946.
"THE TRANSFER OF POWER" VOL, vvii. PAGE. 974

گئی۔ کانگریس کے خیال میں اس سے ایسے طاقتور بلاک وجود میں آجاتے جو آئندہ نہ صرف مرکز پر موثر ہو جائیں گے بلکہ کسی بھی وقت دونوں حصّے "ذیلی وفاق" قائم کرکے ہندوستان کا ناطقہ بند کر دینگے۔ اس کے برخلاف کانگریس چاہتی تھی کہ ۲۳ مارچ کی قرارداد کی کُند چھری [1] ہی سے مسلم لیگ کو ذبح کیا جائے جس میں خود اُس نے ایک محدود، کٹے پھٹے علاقائی پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور جس میں آج بھی اضلاعی زون اور اقطاعی بنیاد پر شمالی آسام۔ مغربی بنگال۔ انبالہ جالندھر اور مشرقی پنجاب کے اکثر اضلاع میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

چند دنوں بعد، کانگریس نے منصوبے کی مشروط منظوری دیکر "خصوصی توجیحات [2]" کا اس طرح اطلاقی حق باقی رکھا کہ منظوری بے معنی ہو کر رہ گئی ــــ!

کانگریس کے بے معنی جواب کی روشنی میں جس سے صاف طور پر عدم تعاون کا اظہار ہوتا تھا۔ ۱۶ جون ۴۶ء کو وائسرائے نے واضح اور صاف اعلان جاری کیا:۔

> "اگر دونوں بڑی پارٹیوں میں سے کسی ایک نے بھی وزارتی مشن کے اس منصوبے کو نامنظور کیا تو حکومت ہند منظور کر لینے والی پارٹی ہی کے تعاون سے بہر حال "عبوری حکومت" قائم کرے گی"!

۲۴ جون ۴۲ء کو کانگریس نے ۱۶ مئی اور ۱۶ جون ۴۶ء کے منصوبے اور بیان کو یکسر رد کرتے ہوئے "عبوری حکومت" میں شرکت سے انکار کر دیا۔

قائد کو یقین تھا کہ اب وائسرائے اپنے ۱۶ جون ۴۶ء کے اعلان کے مطابق

---

(1) "TERRITORIAL RE ADJUSTMENTS."

(۲) "وہ (گاندھی) ہمیشہ اس طرح کی پالیسی بناتا ہے جو نہ اس کے تابعین کی سمجھ میں آئے اور نہ ہی دُنیا اُسے سمجھ پائے۔ تاکہ توجیہہ کی سعادت اسی کو حاصل ہوتی رہے۔!
(دی مارکوئیس آف لن لیتھگو وائسرائے ہند کا خط ایمپرر کے نام۔ ٹیلی گرام ایم ایس ایس۔ ای یو آر ایف ۱۲۵/۲۲۔ نئی دہلی ۲۶ جون ۱۹۴۲ء (ساڑھے ۹ بجے شب)

مسلم لیگ کو دوسری اقلیتی جماعتوں کے تعاون سے "عبوری حکومت" بنانے کی دعوت دیں گے لیکن قائد کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب الکفار لا اعتبار کی تصدیق کرتے ہوئے ۲۶ر جون ۴۶ء کو وزارتی مشن نے نہ صرف یہ کہ "ناگزیر حالات" کی آڑ میں "عبوری حکومت" کی تشکیل کے فیصلے ہی کو واپس لے لیا بلکہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے پوری بے غیرتی کے ساتھ نہرو کی خوشامد پر اتر آیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وزارتی مشن کا منصوبہ اور "عبوری حکومت" کا ڈھکوسلہ محض مسلم لیگ کو ۲۳ر مارچ کی قرار داد سے بھی پیچھے دھکیل دینے کی بڑی سازش تھا تاکہ مجوزہ "وفاق" کو اختیارات کے منتقل ہوتے ہی "مرکزی حکومت" ہندو، ہندوستان میں اپنی بھاری اکثریت کے بنا پر اسے سبوتاژ کر دے۔

مسلمانوں نے شاید ہی ایسے لیل و نہار دیکھے ہوں گے جیسے انھوں نے ۴۶ء اور ۴۷ء میں دیکھے ہیں۔ ہندوستان کی حالت دن بدن ایک ایسے آتش فشاں کی ہوتی جا رہی تھی، جس کا لاوا بہہ نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔ ایک طرف سکھ کرپانیں گھمانے میں مصروف تھے تو دوسری طرف ہندو اور فرقہ پرست جماعتیں ہتھیاروں کے انبار جمع کرنے میں مشغول تھیں۔ رہ گئے انگریز تو وہ خوش تھے کہ ایک اور غدر دیکھنے کا موقعہ ملے گا اور یہی وجہ تھی کہ جنگِ عظیم کے اختتام کے باوجود مشرقی و مغربی محاذ سے ہر ممکن طریقہ پر اس نے "EIGHT ARMY" کو ہندوستان لانے سے روکے رکھا جس نے دوسری جنگِ عظیم کو اختتام تک پہنچانے میں بھرپور کردار ادا کیا تھا ———— وہ "آٹھویں فوج" جس نے سارڈینیا اور سسلی کو روندتے ہوئے اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھا اور بڑی تیزی کے ساتھ اطالوی افواج سے ہتھیار رکھوا کر اپنی شجاعت و بھرپور جنگی صلاحیت کا لوہا منوایا۔

وہ آٹھویں فوج، جسکی قیادت کے عظیم اعزاز پر فیلڈ مارشل منٹگمری نے مرتے

دم تک فخر کیا اور جس کے افسر و سپاہیوں کی بھاری اکثریت ہندوستانی مسلمانوں پر اور خصوصیت کے ساتھ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے اُن نڈر اور جیالے نوجوانوں پر مشتمل تھی جنہیں دُنیا آج بھی "مارشل ریس" کے معزز خطاب سے یاد کرتی ہے وہ نوجوان ——— وہ شاہین کہ جب چلتا اور جھپٹتا ہے تو ارتعاش سے زمین اور گھن گرج سے فضاء دہل جاتی ہے جس کی نسبت زیادہ دن نہیں ہوئے بھارت نے دو تلخ تجربے کیئے اور جس کی نسبت اسرائیل کو انتباہ دیتے ہوئے مشہور امریکی رسالہ "ٹائم" نے لکھا کہ :-

"بہر طور سعودی عرب کو جنگ میں شریک ہونے سے روک رکھا جائے۔ اِس لیئے نہیں کہ سعودی فضائیہ بہت طاقتور ہے بلکہ اس لیئے کہ سعود فضائیہ کی کمان اُن جیوٹے پائیلٹوں کے ہاتھ میں ہے جن کی گولی کا کوئی نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا یعنی ——— پاکستان -!"

ظاہر ہے کانگریس یا برٹش گورنمنٹ مسلم لیگ کو یہ موقعہ کیوں فراہم کرتے کہ وہ تقسیم کے فوری ساتھ "نشان زدہ علاقوں" کا ان کی بُرق آسا پیش قدمی کے ذریعہ قبل از وقت بلواڑہ کرادیں۔ چنانچہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آٹھویں فوج کے اُس حصے کو ہندوستان لایا جاتا رہا ہے جس میں یا تو مسلمان فوجی برائے نام تھے یا اگر تھے بھی تو سکھوں، ڈوگروں، جاٹوں اور گورکھوں کی اچھی خاصی تعداد کو شامل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب ملک تقسیم ہوا تو یہی "فوج" پاکستان کے انتظام و انصرام کے لیے حصے میں آئی جس کی نسبت ۲۰ر فروری ۱۹۴۹ء کو خالقدینا ہال میں تقریر کرتے ہوئے شہید ملت لیاقت علی خان نے کہا :-

"جو بری فوج ہمیں ملی وہ برکوچک میں پھیلی ہوئی تھی

آپ کو تعجب ہوگا کہ انگریزوں کے زمانے میں برطانوی ہند میں خالص سکھوں اور ہندوؤں کی رجمنٹیں تو تھیں مگر خالص مسلمانوں کی کوئی رجمنٹ نہ تھی۔ اگر تھیں بھی تو کسی میں سکھوں کا بٹالین کسی میں ڈوگروں کا بٹالین شامل رہتا تھا۔ لہٰذا مسلمان دستے جو پاکستان کے حصے میں آئے ان کی تعداد کم تھی اور وہ ہند میں پھیلے ہوئے تھے اور تقسیم کے وقت ہمیں ایک بھی بنا بنایا فوجی یونٹ نہیں ملا۔ اس لیے ہمیں پاکستانی فوج کی نئے سرے سے تنظیم کرنی پڑی ......

"دیکھنے کو تو ہمیں فوج ملی لیکن —— کاغذ پر! فوج اور فوجی سامان کے تین حصے ہوئے۔ دو ہندوستان کو ملے اور ایک پاکستان کو ملا، لیکن یہ تقسیم محض کاغذی تھی کیوں کہ وہ فوجیں جو ہماری سمجھی جاتی تھیں۔ سب کی سب ہندوستان میں تھیں اور یہاں بھی ہندوستانی فوجیں ہی مسلط تھیں۔ ہر وقت خوف رہتا تھا کہ نہ جانے یہ ہندوستان کی فوجیں کس وقت کیا کر بیٹھیں۔ میں معافی چاہتا ہوں، میں چھپانا تو نہیں چاہتا مگر اس عام جلسے اور اخباری نمائندوں کی موجودگی میں، میں پاکستان کی دفاعی طاقت کے پورے اعداد و شمار نہیں بتا سکتا۔"

یہ وہ حالات تھے، جس میں، تقسیم سے پہلے ——— جولائی ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کانگریس نے، اسلام و مُسلم فروش مُلاؤں کے بھی تعاون سے دہلی اسمبلی کی (۲۹۲) نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ اپنی تازہ ترین پوزیشن کا اطمینان ہوتے ہی پنڈت نہرو نے وزارتی مشن کے "A.B.C." منصوبے سے یکسر تجاہل برتتے ہوئے، اگلے روز ہی یعنی ۱۰ر جولائی ۴۶ء کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ:-

"اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہندوستان کی
"مملکت متحدہ" کے قیام کے بعد "صوبائی گروپوں"
کی تشکیل کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔"

گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ کانگریس نہ صرف یہ کہ مُسلم لیگ کو ۲۳ر مارچ ۴۰ء کی قرارداد سے ایک انچ بھی آگے بڑھ کر مزید علاقہ اور نیابت دینے کو تیار نہ تھی بلکہ عارضی دس سالہ تجرباتی وفاق کی صورت میں بھی اس داخلی خود مختاری سے محروم رکھنا چاہتی تھی۔ جس کے دونوں ذیلی وفاق اپنی پوری صوبائی وسعت پر ایک اور وفاق کی تشکیل کر سکتے۔

۲۲ر جولائی ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے پھر قلابازی کھائی اور بہر طور کانگریس کو خوش رکھنے کی پالیسی کے پیش نظر اُس نے قائد کو لکھا کہ اگر وہ عہدوں کی تقسیم میں سابقہ پیش کش کے بجائے نئی ترتیب کو قبول کر لیں تو ممکن ہے اس "وسیع النظری" سے متاثر ہو کر کانگریس "عبوری حکومت" کی اُس تشکیل میں شامل ہونے پر رضامند ہو جائے جو ۲۶ر جون ۴۶ء کو وزارتی مشن نے واپس لے لی تھی۔ گویا نئی ترتیب یوں رہے گی:-

کانگریس (۶)

مسلم لیگ (۵)

اقلیتی (۳)

۱۴

"پیش کش" موصول ہونے پر قائد نے جواب دیا :-

"جمہوری حکومت کی تشکیل کی نسبت آپ کی یہ چوتھی تجویز ہے اب تک ہر مرتبہ یہی ہوا کہ آپ کانگریس کو خوش نہ کر سکے اور اُس نے ہر بار آپ کی پیش کش رد کردی اور اس کا ہر دفعہ یہ اثر ہوا کہ آپ نے اپنے منصوبے میں کوئی ایسی ترمیم کردی جو کانگریس کے لیے نفع بخش اور لیگ کے حق میں مُضر تھی۔ اپنی موجودہ تجویز میں آپ نے کانگریس اور مُسلم لیگ کی مساویانہ نمائندگی کے اصول کو قطعاً نظرانداز کردیا ہے اور مُسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کی مستقل اکثریت کی ضمانت دے دی ہے۔"

۲۹ رجولائی ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے جس کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ منصوبے کی منظوری واپس لیکر "راست اقدام" کا فیصلہ کرلیا ــــــــ وائسرائے اور برطانوی وزارتی مشن کی غداری کا یہی واحد جواب اُس وقت ممکن تھا۔

حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے چودھری خلیق الزماں نے لکھا۔

"شملہ کانفرنس کی ناکامی میری نظر میں کوئی سانحہ نہ تھی کیوں کہ بہر نوع اگر نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پانچ پانچ دو ــــــ یا پانچ پانچ تین یا پانچ پانچ چار کے حساب سے
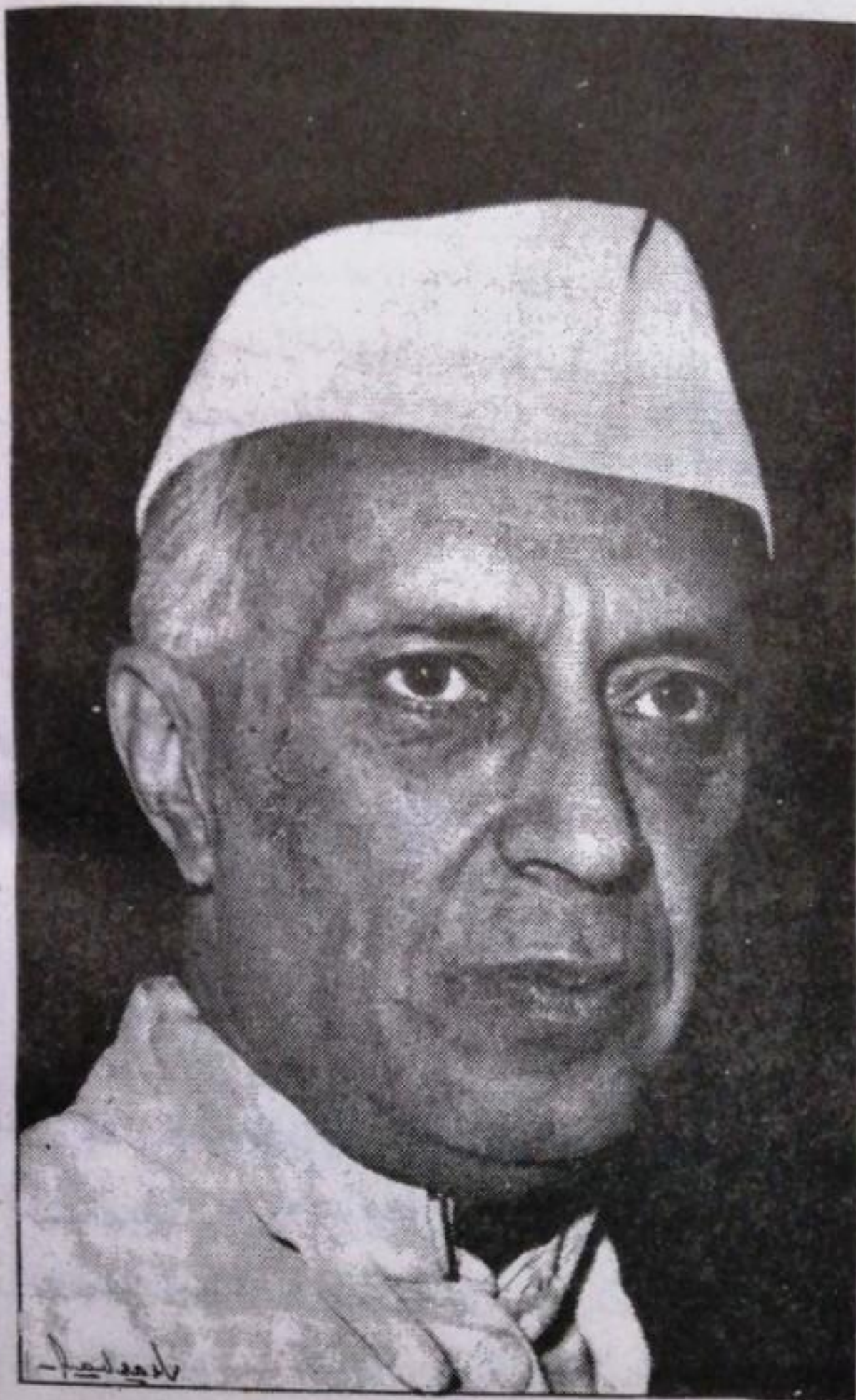
پنڈت جواہر لعل نہرو

ہوتی تو بھی ہر حالت میں مسلم لیگ بہر طور اقلیت میں ہوتی اور اسی خیال سے، جیسا کہ میں بارہا لکھ چکا ہوں، اس سسٹم کی تشکیل کے بالکل خلاف تھا۔ اس قسم کی عددی لڑائی سے اگر مسلمانوں کی کشتی پار لگ سکتی تھی تو پھر پاکستان کا مطالبہ ہی ہم کیوں کرتے۔ میری تو ساری شکایات ہی یہ ہے کہ جس وقت ہم نے ایک الگ اسٹیٹ کا مطالبہ کیا تھا اسی وقت سے ہم کو انگریز پر واضح کر دینا چاہیئے تھا کہ ہم کسی "نیشنل گورنمنٹ" میں شریک نہ ہوں گے اور نہ ہی ایسی نیشنل گورنمنٹ بننے دینگے۔ میرا آج بھی یہ عقیدہ ہے کہ اگر ہم نے شروع ہی سے یہ پالیسی اختیار کر لی ہوتی اور انگریز کی کھل کر جنگ میں امداد کی ہوتی (یعنی وائسرائے کی ڈیفنس کونسل سے جبری طور پر اپنے نمائندے تک واپس نہ بلا لیے ہوتے) تو ہم کو پورا پاکستان، جس کے ڈانڈے جمنا پر ہوتے مل گیا ہوتا۔ سارا سیاسی نقشہ اسی وقت سے بدل گیا ہوتا۔ نہ کرپس مشن آتا اور نہ کیبنٹ مشن آتا۔ جب دینا ہی انگریز کے ہاتھ میں تھا تو، ہمارا پورا مطالبہ وہ قبول کرنے پر مجبور ہوتا۔"

انگریز کی چاپلوسی کے ذریعہ "حصولِ مقصد" کا یہ دوسرا زرین و خوش فہمانہ نسخہ تھا جو ان سے پہلے آغا خان صاحب نے آئین ۱۹۳۵ء کی "اصلاحات" کو منظور کر لینے کے سلسلے میں کاسہ لیسوں کو دیا تھا۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس مرحلے پر انگریزوں کے حامی مسلم لیڈروں نے قائد سے کیوں تعاون نہیں کیا تھا۔ ان میں پنجاب کے سر فضل

حسین، یو۔پی کے سر احمد سعید خان، نواب آف چھتاری، سر شفاعت احمد خان، سر محمدؒ یوسف، سندھ کے سر غلام حسین ہدایت اللہ اور صوبۂ سرحد کے سر عبدالقیوم شامل تھے۔ یہ تمام حضرات بڑی حد تک برطانوی افسروں کے زیرِ اثر تھے۔ مزید برآں ہندوستان کی مسلم سیاست میں قائدؒ کی اُس وقت نئے سرے سے آمد کی وجہ سے حالات نے جو رُخ اختیار کیا تھا اُس پر آغا خان بھی چونک گئے تھے۔ آغا خان کی خواہش بھی یہی تھی کہ مسلمان نئی اصلاحات قبول کریں۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں برطانیہ کے حامی مسلم رہنماؤں سے مراسلت میں مصروف تھے اور ہارون، یوسف، چھتاری اور دیگر لیڈروں پر زور دے رہے تھے کہ وہ سب وہی پالیسی اختیار کریں جو فضل حسین نے پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کی تنظیمِ نو کر کے اختیار کی ہے۔ وہ اِن لوگوں کو تلقین کر رہے تھے کہ برطانیہ کی حمایت کی پالیسی اختیار کر کے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ہونے والے انتخابات میں حصّہ لینے کی تیاری کریں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے سر فضل حسین کے اصرار پر فروری ۱۹۳۶ء میں دہلی کے مقام پر ہونے والی آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انتظامی بورڈ کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی حالانکہ اُن کا یہ اقدام ایک طرح سے مسلم لیگ کو زک اور نقصان پہنچانے کے مترادف تھا۔ یہ وہی مسلم لیگ تھی جسے جناح کی قیادت میں متحد کرنے کے لیے ۱۹۳۴ء میں خود انہوں نے بھی بہت کوششیں کی تھیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُس دور میں آغا خان نے کس بنا پر سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کی مالی امداد کی تھی اور جناح کی مسلم لیگ کی مالی اعانت سے کیوں ہاتھ کھینچ رکھا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے بارے میں خود قائدؒ کچھ اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "وہ یہ سب بے ہمت اور بزدل لوگ، مجھ سے خواہ کچھ ہی وعدے کیوں نہ کریں۔ ڈپٹی کمشنر سے ضرور یہ دریافت کرتے ہیں کہ اُنھیں کیا کرنا چاہیے۔"[1]

---

[1] کتاب "قائدِ اعظم۔ حیات و خدمات" مصنفہ جناب شریف المجاہد۔ مترجمہ جناب خواجہ رضی حیدر صفحہ ۷۸-۷۹۔

ممکن ہے چودھری صاحب نے بھی یہ زرین رائے کسی ڈپٹی کمشنر سے پوچھ کر ہی ظاہر کی ہو۔ شاید انھیں معلوم نہ تھا کہ کرگس اور شاہین کے جہاں میں کتنا فرق ہے ۔!

وائسرائے نے پوری بددیانتی سے قائد کے ۸ رجون کے اعلان کے ان انتہا ہی الفاظ کو کہ "پانچ پانچ اور دو کے تناسب کی کوئی تبدیلی مسلم لیگ کی اس منظوری کو خطرے میں ڈال سکتی ہے"۔ مسلم لیگ کے انکار کے معنی پہنا کے ۱۲ر اگست ۴۶ء کو نہرو کو دعوت دی کہ وہ عبوری حکومت بنائیں ۔ پنڈت نہرو نے قائد اعظم سے درخواست کی کہ وہ "عبوری حکومت" کے لیے اراکین کے نام تجویز کر کے انھیں دیں۔ اس غلط طریقۂ کار کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے قائد نے "راست اقدام" کے لیے ۱۶ر اگست ۴۶ء کی تاریخ مقرر کر دی۔

۱۶ر اگست ۴۶ء کو مسلم لیگ کے "پُرامن راست اقدام" کے اعلان نے تو جیسے اُنگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ فراہم کر دیا ۔ پنجاب میں سکھ اور بنگال و بہار اور صوبہ متحدہ میں دشمنِ اسلام شرپسندوں نے ہندو مہاسبھا کے تعاون سے اسلحہ کے ڈھیر جمع کر لیے اور جب ۱۶ر اگست ۴۶ء کو ہندو اکثریتی شہر کلکتہ میں نہتے مسلمانوں کا جلوس نکلا تو آناً فاناً مسلح ہندو غنڈوں نے مسلمانوں کو خون میں نہلا دیا۔ یہی حال بازار اور گھروں میں خالی الذہن بیٹھے مسلمانوں کا ہوا۔ مجموعی حیثیت سے تقریباً بتیس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ پھر اکتوبر اور نومبر ۴۶ء میں اچانک ہی بہار میں ہندوؤں نے دھاوا بول دیا اور مجموعی حیثیت سے (۵۰) ہزار مسلمانوں کو جن میں مرد ۔ عورت جوان، بوڑھے اور بچے بھی شامل تھے ۔ موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مسلم عورتوں کی جو عصمت دری کی گئی اُس میں عمر کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ۔ یہی حال گڑھ مکتیشر کی خون

ریزی کا ہوا۔ (۱)

"اور صوبہ متحدہ میں تو" —— جیسا کہ جنرل سرفرانسس ٹکر، جنرل آفیسر کمانڈنگ ان چیف ایسٹرن کمانڈ نے اپنی کتاب "WHILE MEMORY SERVES" میں لکھا۔ "ظالموں نے حد کردی، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کرکے ان میں سے بچے نکال لیے اور پھر انھیں پٹخ پٹخ کران کا بھیجہ پاش پاش کردیا۔ بعض توی ہیکل درندوں نے عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر ان کی ٹانگیں چیر ڈالیں اور جن بے شمار عورتوں کی عصمت دری کی گئی ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔"

"الکفار امّت واحدہ" کی تصدیق کرتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ ویول نے پھر سے کانگریس کی خوشامد شروع کردی اور ذاتی طور پر کلکتہ کا دورہ کیا۔ گورنر نے انھیں بتلایا کہ مسلمانوں میں اموات زیادہ ہوئی ہیں۔ دہلی پہنچنے پر وائسرائے نے لیگ سے کوئی مشورہ لیے بغیر ہی ۲۴ اگست ۴۶ء کو "عبوری حکومت" کے قیام کا اعلان کردیا اور اسی ۲۴ اگسٹ کی شام بڑی بے غیرتی سے وائسرائے نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر نشر کی اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اس قائم ہونے والی "عبوری حکومت" سے تعاون کریں۔ وائسرائے کے اس یکطرفہ اقدام کی نسبت سیکرٹری اسٹیٹ نے بھی جب زور دیا کہ کسی طور پر لیگ کا تعاون حاصل کیا جائے تو ویول نے سیکرٹری اسٹیٹ

---

(۱) پچاس ہزار سے زائد مسلمانوں کو قتل اور زندہ جلا دیا گیا۔ (۸۰) فیصد تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی (رپورٹ جنرل سیکرٹری بہار پراونشل مسلم لیگ پٹنہ۔ فروری (۱۹۴۷ء) عکسی فوٹو شائع شدہ اخبار جنگ کراچی آزادی نمبر ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء۔ "بہار میں جو کچھ ہوا ہے ہولناک ہے۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا انسان اس قسم کا سلوک کرسکتے ہیں۔" (پنڈت نہرو) "بہار میں ہونے والی بربریت نے آرمینی مظالم کی یاد تازہ کردی ہے۔" (چرچل)

ہند کو جواب میں لکھا کہ :۔

"اس سے صرف جناح کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہو گا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ میں مشورہ دیتا ہوں کہ اس وقت جناح کو تنہا رہنے دیا جائے۔"

اپنی کتاب ——— ویول، دی وائسرائے (نہ) جنرل ——— میں ویول نے اعتراف کیا کہ "مجھے یہ بات بہت ناگوار گزری، دراصل یہ میرے لیے باعث کرب تھی"۔

۲۹ اگست کو بمبئی میں وائسرائے کی اس غداری کا ذکر کرتے ہوئے قائد نے اپنی تقریر کے دوران کہا :۔

"وائسرائے نے مسلمانوں کے ساتھ دوہری غداری کی ہے۔ پہلے وہ اپنے وعدے سے پھر گئے اور اب انھوں نے مسلم لیگ کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حکومت برطانیہ اور اس کی لیبر پارٹی ہندوستان کے سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر بھی ہے یا نہیں۔ مگر مجھ کو شبہ ہے کہ ہندوستان میں حکومت کے کرتا دھرتا یہ کوششیں کر رہے ہیں کہ یہاں کے حالات برطانوی عوام اور اخبارات کو پوری طرح معلوم نہ ہو سکیں۔

وائسرائے نے جو مذموم حرکت آج کی ہے وہ برطانوی حکومت کی اس پالیسی کی صریح خلاف ورزی ہے جس کا اعلان اس نے ۸ اگست ۱۹۴۰ء کے پیراگراف (۲) میں کیا تھا کہ :۔

"اس شک کو کہ اقلیتوں کو کسی آئندہ کے دستور میں کافی

تحفظات نہ ہوں گے کو دُور کرنے کے لیے برٹش
گورنمنٹ اعادہ کرتی ہے کہ اقلیتوں کی رائے کو کافی
وزن دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ حکومت، امن اور
ہندوستان کی بہبود کی ذمہ داریاں کسی ایسی طرز کی
گورنمنٹ کو منتقل نہیں کر سکتی جس کے اقتدار و اختیارات
کے واضح طور پر ہندوستان کی قومی زندگی میں بڑے اور
باوقار عنصر مخالف ہوں اور نہ حکومت ایسے عناصر کو ایسی
حکومتوں کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کرے گی"۔

لیبر پارٹی اُس وقت برطانیہ کے چرچل کی "قومی حکومت" میں شامل تھی اور ہندوستان کے متعلق وہ پالیسی اس کی رضامندی سے وضع کی گئی تھی۔ لہٰذا وہ اس کی پابند ہے۔"

بعد چند دن کے برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ اٹیلی نے قائد کو جواب بھیجا کہ :۔

"حالات کے لحاظ سے وعدوں کو بدلنا ہی پڑتا ہے"۔ !

گاندھی نے وائسرائے کی ان کوششوں کو کانگریس کے خلاف جانا اور اُس نے ایک سخت خط میں وائسرائے کو آگاہ کیا کہ :۔

"کانگریس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ (مسلم لیگ کے
آگے) جھکے گی اور ایک ایسی راہ اختیار کرے گی جسے وہ غلط
تصور کرتی ہے اور جس کا تھوڑے ہی عرصہ قبل اُس نے بنگال
میں مظاہرہ کیا ہے"۔

اس "منہ پہ جھوٹ بولے تو کیا دیتے" کا ویول کیا جواب دیتا جب کہ وہ خود ہی چشم دید گواہ تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ شہر کلکتہ کی مسلم آبادی صرف (۲۳) فیصد

ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی کتاب میں اس گیانی مہاتما کے بارے میں رائے ظاہر کی :۔

"پرلے درجے کا چالاک، ضدی، حاکمانہ روش کا
مالک، دوغلا اور زگ زیگ قسم کا سیاست دان ہے۔"

گاندھی کے خط سے اگلے دن، بقول لارڈ ویول، انھیں انگلینڈ سے ایک "کرب ناک برقیہ" موصول ہوا۔ جس میں اُنھیں کانگریس کے ساتھ غیر محتاط رویہ اختیار نہ کرنے کی سختی سے ہدایت کی گئی تھی۔ دو دن بعد ہی، وائسرائے نے ایک اور برقیہ وصول کیا :۔

"کسی بھی صورت میں، ایسا اقدام کیا جائے اور نہ ہی ایسی
بات کہی جائے جس کا نتیجہ کانگریس کے ساتھ حکومتِ
برطانیہ کے تعلقات کی خرابی پر منتج ہو سکے۔"

۱۳ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی شمولیت کے ساتھ "عبوری حکومت" قائم ہونے کے باوجود باہمی تعلقات سانپ اور نیولے کی دوستی سے آگے نہیں جا سکے صورتِ حال دن بدن خراب ہوتی گئی۔ ادھر کثرتِ کار اور شبانہ روز محنت نے قائدِاعظم کی صحت کا ناس مار دیا۔ عرصے سے لگی ہوئی تپ دق (T. B) جس کا علم دونوں بھائی بہن اور ڈاکٹر کے سوا کچھ کو نہیں تھا زور مار ا اور قائد بہت زیادہ کمزور ہو گئے مگر یہ قائد ہی کی عظیم قوتِ ارادی تھی جس کی بنا پر انھوں نے آخر وقت تک کام سے ہاتھ نہیں روکا اور مسلسل محنت کرتے رہے۔ بالآخر کانگریس کی ریشہ دوانیاں اور ذاتی تعلقات رنگ لے آئے۔ اور ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو کانگریس کے چہیتے اور پنڈت نہرو کے ذاتی دوست آنجہانی (ارل) لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے بحیثیت آخری وائسرائے و گورنر جنرل ہند وائسرائے ہاؤس لاج دہلی میں قدم رکھا۔

۱۴ اپریل ۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے قائدِاعظم پر دباؤ ڈالا کہ وہ وزارتی مشن

کی دوسری پیش کش کے مطابق " وفاق " میں شامل ہو جائیں لیکن قائدؒ نے محض اس لیے انکار کر دیا کہ وہ اس بارے میں پنڈت نہرو کے ۱۰ر جولائی کے بیان کو بھولے نہیں تھے۔ مجوزہ " مرکزی حکومت " قائم ہو کر اقتدار کی منتقلی کے بعد ان کالی کے پجاریوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ابنِ قاسم سے لیکر اورنگ زیب تک کے سارے نہ کردہ واقعات کا مسلمانوں سے بدلہ نہیں لینگے۔ اس وقت ہاں کرنے کے معنی کاتے سوت کو پھر کپاس کرنا تھا۔ اس کے معنی ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی اُس قرار داد سے بھی ہاتھ دھونے کے ہوتے ہیں جس کی بنا، پر کٹا پٹا ہی سہی لیکن "پاکستان" تو تھا۔

اسی مہینے وائسرائے نے تقسیم پنجاب اور بنگال کے سلسلے میں قائدین سے مذاکرات کیئے۔ قائدِ اعظم نے " دونوں مسلم اکثریتی صوبوں کی تقسیم کی مخالفت کی اور کہا کہ ایسی تقسیم مسلمانوں کو ایک کرم خوردہ پاکستان دینے کے مترادف ہو گی "۔ حسین شہید سہروردی نے تجویز پیش کی کہ صوبہ جات کی تقسیم کے سلسلے میں پنجاب۔ بنگال اور آسام کی رائے حاصل کی جائے کہ آیا وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔ سہروردی نے خیال ظاہر کیا کہ وہ بنگال کو " متحدہ بنگال " رہنے پر راضی کر لیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو وہ قائدِ اعظم کو راضی کر لیں گے کہ مسلم بنگال ایک مسلم وفاقی یونٹ کی حیثیت میں مجوزہ وفاق کا رکن بن جائے گا اور ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی میں شریک نہیں ہو گا۔ ماونٹ بیٹن نے اس کو ایک خوش آئند خیال ظاہر کرتے ہوئے ایک اجلاس کے دوران جب قائدِ اعظم سے ذکر کیا تو قائدؒ نے جواب دیا کہ " میں اس پر خوش ہوں گا کیوں کہ کلکتہ کے بغیر بنگال بے سود ہے "۔ قائدؒ نے دورانِ گفتگو یہ بات بھی واضح کر دی کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اقتدار اہلِ ہند کے حوالے کر دیا جائے ——— ترجیحاً

صوبوں کی بنیاد پر - اور انھیں موقعہ دیا جائے کہ وہ جیسے چاہیں گروپ بنا لیں۔ لیکن کانگریس ہائی کمان نے اس کی یوں مخالفت کی کہ اُس کی رائے میں یہ ناقابل اعتبار مسلمانوں کی ایک چال تھی جس کے سبب حالیہ مردم شماری میں اپنی بھاری صوبائی اکثریت، کی بنا پر ۲۳ مارچ کی مطابق زونل آبادی سے زیادہ علاقہ ہتیانا چاہتی ہے تاکہ "تجدید" کی تاریخ سے پہلے ہی جب جی میں آئے "ذیلی وفاق" مرکز سے الگ ہو کر اپنا ہی علیحدہ وفاق قائم کرے۔

نوبت جب یہاں تک پہنچ گئی تو قائد کے پاس بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ وہ تقسیم ہند کے مطالبہ کو دہرائیں۔ وائسرائے سے اپنی ملاقات کے دوران انھوں نے کہا کہ "موجودہ حالات میں وزارتی مشن کے منصوبے کو دہرانا بے معنی بات ہوگی۔ ہندوؤں کے ساتھ گھل مل کر رہنا تو دور کی بات ہے - اب مل جل کر بیٹھنا بھی دشوار ہے۔ قائد نے وضاحت کی کہ :-

> "موجودہ حالات میں تقسیم ہند ہی مسئلہ کا واحد حل ہے کیوں کہ ہم مسلمان، اپنی جداگانہ ثقافت، تہذیب - زبان، ادب، آرٹ اور فن تعمیر، قوانین اور اخلاقی ضابطوں، رسوم - کیلنڈر، تاریخ اور روایات اور ہر لحاظ سے ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہندوستان کبھی بھی ایک کامل قوم نہیں رہا۔ جس گائے کو میں کھانا چاہتا ہوں ہندو اُسے ذبح کرنے سے منع کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ جب بھی کوئی ہندو مجھ سے ہاتھ ملاتا ہے تو اُسے بعد ازاں اپنا ہاتھ صاف کرنا پڑتا ہے۔ اگر فی الحال ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی چیز مشترک قرار دی جاسکتی ہے تو وہ صرف انگریزی کی غلامی ہے"——!

بالآخر وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ اس طور پر ضروری ڈھانچہ تیار کرے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے تقسیم ہند کو آخری شکل دی جا سکے۔ کمیٹی کے ارکان نے معروف سیاستدانوں سے بات چیت کی۔ کانگریس نے اپنے اسی موقف کو دہرایا کہ بدلی ہوئی مردم شماری کے باوجود وہ مسلم لیگ کو اپنی ۲۳ مارچ کی قرارداد سے ایک انچ بھی آگے نہیں آنے دے گی کیوں کہ پنجاب، بنگال اور آسام کے مجموعی طور پر مسلم اکثریتی صوبہ ہونے کے باوجود اس کے اکثر اضلاع اپنی بھاری غیر مسلم اکثریت رکھتے ہیں اور یہ غیر مسلم اکثریت نہ خود پاکستان میں رہنے پر تیار ہو گی اور نہ ہی کانگریس اس بات پر آمادہ ہو گی کہ انھیں مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔[۱] ہندوستان کے گیارہ گورنروں کی کانفرنس میں بالآخر طے ہو گیا کہ:۔

(۱) مسلم اکثریت کے دو بڑے صوبوں، پنجاب اور بنگال کی اس طور پر تقسیم عمل میں لائی جائے کہ فریقین کی واضح اکثریت ایک حصے میں سمٹ آئے۔

(۲) صوبۂ آسام کے مسلمانوں کو باوجود جُداگانہ صوبہ ہونے کے یہ حق دیا جائے کہ وہ چاہیں تو سلہٹ سمیت اپنے اکثریتی اضلاع کے ساتھ صوبۂ بنگال میں ضم ہو جائیں۔

(۳) اسی طرح شمال مغربی سرحدی صوبے کی بھی رائے معلوم کر لی جائے۔

---

(۱) ۔ وزارتی مشن نے بھی ۱۶ جون ۴۶ء کے بیان میں بدقسمتی سے کچھ یہی دلیل دی تھی کہ اگر ہندوستان کی تقسیم کے لیئے پیش کیے جانے والے دلائل صحیح ہیں تو ان ہی دلائل پر، غیر مسلم، صوبہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کر سکتے ہیں ("آزادی کی کہانی' میری زبانی" ص ۱۲۰-۱۱۱)

ماؤنٹ بیٹن نے لندن سے واپسی پر ۲ رجون ۱۹۴۷ء کی صبح دس بجے وائسریگل لاج نئی دہلی میں ان ہندوستانی رہنماؤں کی میٹنگ طلب کی جن سے تقسیم ہند کے اس منصوبے کی منظوری لینی تھی اور جس کے "بیحد راز" مسودے کی اس نے انتہائی "راز" میں پنڈت نہرو سے منظوری حاصل کرلی تھی جب وہ اُسکے ذاتی دوست کی حیثیت سے وائسریگل لاج میں مقیم تھے۔ کانفرنس میں ایک طرف پنڈت نہرو۔ ولبھ بھائی پٹیل اور مسٹر آچاریہ کرپلانی کانگریس کی جانب سے شرکت کی تو دوسری طرف سے قائداعظم جناح۔ مسٹر لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر نے مُسلم لیگ کی نیابت کی سکھوں کی جانب سے سردار بلدیو سنگھ واحد نمائندہ تھے۔ وائسرائے کی امداد کے لیے لارڈ اسمے اور سر ایرک میول اور لیفٹننٹ کرنل آرن کرم موجود رہے۔

سب سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے سوال کیا کہ "کیا اس آخری موقعہ پر آپ تیار ہوں گے کہ کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرلیں"؟ قائد کے ایک لفظی جواب "نہیں" کے ساتھ ہی تقسیم کے مجوزہ خاکہ کی ایک ایک کاپی ماؤنٹ بیٹن نے شرکار اجلاس میں تقسیم کرتے ہوئے "پلان" کی مختصر وضاحت کی۔ آخر میں وائسرائے نے درخواست کی کہ پیش کردہ تجویز کی منظوری یا عدم منظوری کی نسبت آج، آدھی رات سے قبل اطلاع دیدی جائے۔ اس نے کہا کہ اگر جواب "ہاں" میں ہے تو اگلے دن صبح ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو اس تجویز کی منظوری کا اعلان پنڈت نہرو، مسٹر جناح اور بلدیو سنگھ ریڈیو پر کردینگے اور اس کے بعد برطانوی وزیراعظم بی بی سی پر تصدیقی تقریر نشر کریں گے۔

۳ رجون ۱۹۴۷ء کی صبح جب تمام شرکار ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قائد کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے ـــــ قائد جس نے زندگی بھر کوئی غیر آئینی کام نہیں کیا ـــــ قائد ـــــ جس نے

تمام عمر کوئی خلافِ قانون حرکت نہیں کی وہ "ضدی قائد" جس نے اپنے ذاتی معاملات میں بھی اپنی بہن فاطمہ سے مشورہ نہیں کی پوری مملکتِ اسلامیہ پر اپنی "ہاں" کے فیصلے کے نتائج و عوامل کی نسبت عاملہ کے اور کونسل کے مشورے اور فیصلے کا خواہشمند تھا۔

اور جب قائد بولے تو اُن کا لہجہ صاف اور واضح تھا ——————— "میں چاہتا ہوں ——————— قائد نے کہا ——————— لیڈروں کے حقیقی قائد عوام ہیں' ان سے پوچھے بغیر کوئی تجویز تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ یہ دُرست ہے کہ دونوں اطراف سے اس پلان کے مختلف حصوں سے اتفاق نہیں کیا گیا لیکن مسلم لیگ کی طرف سے اسے باضابطہ طور پر تسلیم کرنے میں وقت لگے گا۔ چونکہ یہ کام مسلم لیگ کے آئینی ضابطوں کے مطابق کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ صرف لیڈروں اور ورکنگ کمیٹی کے (۲۱) افراد پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ مسلم لیگ میں ورکنگ کمیٹی کے علاوہ بھی بے شمار اہم لوگ ہیں' ان سے بھی مشورہ کرنا پڑے گا اور عوام کو بھی اپنا ہم خیال بنانا پڑے گا اور اس کے لیے بڑی محنت کرنا پڑے گی۔ میں کوئی وعدہ کیئے بغیر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم نے اس پلان کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ہم کوشش کریں گے کہ اس پر عمل بغیر خون خرابے کے پُرامن طریقہ سے کیا جائے۔" وائسرائے نے کہا "مجھے لیڈروں پر مکمل اعتماد ہے کہ وہ اُسے ایمانداری سے قبول کروانے میں مصروف ہیں۔ لہٰذا میں ان سے صرف اصولی سمجھوتے کا خواہاں ہوں۔" قائد نے کہا۔ "میں تو صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ پلان نیک نیتی پر مبنی ہے لیکن حتمی جواب دینے کے لیے مجھے ان تجویزوں کو عوام کو سمجھانا ہوگا۔ مسلم لیگ ایک جمہوری جماعت ہے' مجھے اور میری ورکنگ کمیٹی کو ان تجویزوں کے ساتھ اپنے آقاؤں کے روبرو پیش ہونا پڑے گا اور ہمارے آقا' ہمارے عوام ہیں اور وہی آخری فیصلہ کرنے کے حقدار ہیں۔" وائسرائے نے ٹوکا "کئی دفعہ لیڈروں

کو فوری طور پر فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔" قائد نے جواب دیا "اگر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سامنے جس کی میٹنگ ایک ہفتے کے اندر ہو سکتی ہے کوئی بنا بنایا فیصلہ رکھا گیا تو وہ لازماً کہیں گے کہ ان کی رائے حاصل کیے بغیر انہیں اس فیصلے کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ یہ ان کے لیے پریشان کن بات ہو گی اور وہ بجا طور پر پوچھیں گے کہ پھر انہیں میٹنگ میں مدعو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان سے یہ تجویز منوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر میں پیش از وقت ان کے اقرار کی گواہی نہیں دے سکتا۔ میں اپنی طرف سے بھرپور کوشش کروں گا اور اس دوران ہر ممکن قدم اٹھاؤں گا جس سے لوگ پُر امن رہیں اور کہیں بھی کسی قسم کا کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ میں اپنے عوام سے جو ہمارے حقیقی آقا ہیں اُن کے سامنے یہ تجویز رد کروانے کے لیے نہیں لے کر جاؤں گا بلکہ ہر ممکن کوشش کروں گا کہ وہ اُسے تسلیم کرنے پر رضامند ہو جائیں (۱) ——— بہتر ہو گا اجلاس کی کارروائی ایک ہفتے کے لیے ملتوی کر دی جائے۔"

پنڈت نہرو کو اپنی کرسی گھومتی نظر آئی۔ ان کے برہمنی دماغ نے تیزی سے حساب لگایا کہ اڑتالیس گھنٹے کی مہلت پر محمود سومنات اُلٹ سکتا ہے تو یہ تو جناح ہے ——— معلوم نہیں ایک ہفتے کی "مہلت" میں کس کس کا کریا کرم کر دے۔

پنڈت جی کو کوئی ٹھنڈی سی چیز ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتے محسوس ہوئی جھرجھری لے کر بڑی بے بسی سے اُنہوں نے ماؤنٹ بیٹن کی طرف دیکھا۔ ماؤنٹ بیٹن سمجھ گیا کہ "پاکستانی شارک" تیزی کے ساتھ حملے کی پوزیشن اختیار کر رہی ہے۔ اگر فیصلے میں ذرا بھی تاخیر ہوئی تو مجھ سمیت شرکا کا صفایا کر دے گی۔ فیصلہ کن انداز میں وائسرائے نے جواب دیا "میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بوقت موجودہ کسی بھی قسم کی مہلت نہیں دی جا سکتی ——— آپ کا پاکستان فوری طور پر اس منصوبے

---

(۱) ٹرانسفر آف پاور۔ جلد (۱۱) مترجمہ موقر ہفت روزہ "معیار" کراچی اشاعت ۳۱ مارچ ۶ تا اپریل ۱۹۸۴ء۔

کو منظور کر لینے پر بن سکتا ہے ورنہ ______ کوئی دوسری صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔" قائد مجبور ہو گئے ______ قائد کے پاس سوائے "ہاں" کے کوئی چارہ نہ رہا ______ ۲۲ مارچ کی خامی کو دور کرنے کا جو آخری موقعہ تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اُفق میں گم ہو گیا ______!

وقت کی تنگی اور نازک صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو خالقدینا ہال کراچی کی تقریر کے دوران مرحوم وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کہا :-

"آپ کو یاد ہو گا کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو یہ طے ہوا تھا کہ ۱۵ اگست ۴۷ء کو ہند میں دو آزاد مملکتیں یعنی ہندوستان اور پاکستان قائم ہو جائیں گی اور پاکستان کی حکومت ۱۵ اگست سے الگ ہو جائے گی۔ ہم نے کہا کہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں ایسے عظیم الشان ملک اور اتنی بڑی آبادی کے لیے ایک ایسی حکومت کا قیام ناممکن ہے۔ جس کے پاس نہ دفتر ہو نہ اسٹاف۔ نہ کاغذ ہو نہ پنسل۔ مگر ہمیں یہ جواب دیا گیا کہ ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ گویا حکومتِ برطانیہ نے ہم کو چیلنج دیا۔ اگر خود حکومتِ برطانیہ سے کہا جاتا کہ لندن سے نکل کر کسی دوسری جگہ چلے جاؤ اور دو مہینے میں نئی حکومت قائم کر لو تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ پُر امن زمانے میں بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکتی۔ شاید حکومتِ برطانیہ کو معلوم نہ تھا کہ مسلمانوں کا عزم بالجزم کتنی عظیم الشان چیز ہے۔

بہرکیف، ہم نے برطانیہ اور ہند کا چیلنج قبول کر لیا۔"

۳ جون ۴۷ء کے تقسیم ہند کے اعلان کے نتیجے میں ماؤنٹ بیٹن کو پورا یقین تھا کہ قائم ہونے والی مملکتیں اُسے اپنا مشترک گورنر جنرل بنالینگی لیکن قائد نے اس ہندو نواز مسلم دشمن شخص کو صاف بتلادیا کہ وہ خود مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ ہوں گے۔ ٹکا سا جواب ملنے پر ماؤنٹ بیٹن نے قائد کو دھمکی دی کہ "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس جواب کی آپ کو بہت بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔"(۱)

"یہ دو قومی نظریہ" ـــــــ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں لکھا۔

"تقسیم ہند کے بعد کا عرصہ ان چار کروڑ مسلمانوں کے لیے جو ہندوستان میں رہ گئے بڑا ہولناک ثابت ہوا کیوں کہ ۱۴ اور ۱۵ اگست ۴۷ء کو نہ وہ پاکستانی "اُمت" رہ گئے اور نہ ہندوستانی "قوم"۔ جس کی وجہ سے ان پر بدترین مصائب نازل ہوئے۔ یکم اگست ۴۷ء کو مسٹر جناح نے ہندوستان کے "اقلیتی نمائندوں" سے رخصت ہونے کے لیے ان کو بلوایا ـــــــ اس موقعہ پر سید رضوان اللہ سیکرٹری یوپی مسلم لیگ اور ممبر

---

(۱) "ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ مسٹر جناح کو آپ کا ۴ر جولائی ۱۹۴۷ء کا خط شام ساڑھے چھ بجے ملا۔ مجھے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ آپ کو مطلع کروں کہ آل انڈیا مسلم لیگ جو کہ جانشین اور وارث اتھارٹی ہے۔ ہز مجسٹی بادشاہ کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے مسٹر ایم، اے جناح کا نام منظور کریں۔ ـــ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کانگریس آپکو انڈین ڈومینین کا گورنر جنرل رکھنا چاہتی ہے اور اگر آپ اُسے منظور کر لیں گے تو ہمیں خوشی ہوگی اور ہمیں اُمید ہے کہ دونوں گورنر جنرل آپس میں مل جل کر اور باہمی تعاون کے ساتھ تقسیم کے معاملات منصفانہ طور پر تکمیل کو پہنچا ئینگے"!
۵ر جولائی ۱۹۴۷ء (نواب زادہ لیاقت علی خان کا خط بنام لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل ہند۔ شائع شدہ "ٹرانسفر آف پاور ۴۷-۱۹۴۲ء)

کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی دہلی نے اقلیتی مسلمانوں کے مستقبل
کے متعلق جناح صاحب سے کچھ بہت ٹیڑھے سوالات
کیئے جن پر وہ بہت پریشان نظر آئے...... اس
سے پہلے انھیں اس قدر پریشان میں نے کبھی نہیں دیکھا
—— گفتگو کی یہ نوعیت دیکھ کر میں نے اُسے ختم
کرانا ہی مناسب سمجھا اور رضوان اللہ سے کہا "جو کچھ ہونا
تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب اس کا اعادہ ضروری نہیں۔"

رضوان اللہ کی اس گفتگو کا اثر مسٹر جناح پر اتنا گہرا اور عمیق پڑا کہ
۱۱ اگسٹ ۱۹۴۷ کو بحیثیت ہونے والے گورنر جنرل پاکستان اور صدر پاکستان
کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی انھوں نے اپنے ہی "دو قومی نظریہ" کی یوں "دھجیاں" اڑا دیں۔

"اب اگر ہم پاکستان اسٹیٹ کو بافراغت اور خوش دیکھنا
چاہتے ہیں تو ہم کو کلیتہً عوام کی، خصوصاً غربا کی خدمت
میں لگ جانا چاہیئے۔ اگر ہم سب، گزشتہ واقعات
کو بھلا کر اور اختلاف کو ختم کر کے متحدہ طور پر کام میں مشغول
ہو جائیں تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ اگر ہم اپنا ماضی
بدل ڈالیں اور سب مل کر یک جہتی سے کام شروع
کر دیں۔ خواہ تمہارے آپس کے تعلقات پہلے کچھ ہی رہے
ہوں۔ خواہ تمہارا رنگ، ذات اور دین کچھ ہی رہا ہو۔
مگر وہ اب ہر صورت سے پاکستان کا شہری ہے جس
کے تمام وہی حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔ جو کسی اور کے

ہیں۔ اس سے زائد میں اس پر زور نہیں دے سکتا۔[1]

ہم کو جذبے سے کام کرنا ہے اور تھوڑے عرصے میں

اکثریت اور اقلیت ——— ہندو قوم اور

مسلم قوم ——— کے قضیے ختم ہو جائیں گے

کیوں کہ خود مسلمانوں میں، پٹھان، پنجابی اور شیعہ اور

سُنّی وغیرہ ہیں اور اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، ویش

کھتری اور بنگالی اور مدراسی وغیرہ۔ یہ سب دور ہو جائیں

گے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو حقیقت یہ ہے کہ

ہندوستان کی آزادی میں یہی مختلف حالات حارج

رہے ورنہ ہم پہلے ——— بہت پہلے آزاد ہو گئے

ہوتے ——— آپ کسی مذہب یا عقیدے

کے ہوں، اس کو اسٹیٹ کے کام سے کوئی واسطہ نہیں

ہے" ——— ![2]

گویا یہ "دھجیاں" قائد نے اپنی اس ۱۹۴۵ء کی نظریاتی تقریر کی اڑائی

تھیں جس نے ایک اٹل حقیقت کی حیثیت سے بین الاقوامی دُنیا کو اس پر غور کرنے

کے لیے مجبور کر دیا تھا اور جو آل انڈیا مسلم لیگ کی ناقابلِ شکست پالیسی کے

۱۔ پاکستان کے مایہ ناز فرزند۔ محقق و تاریخ دان ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کے الفاظ میں۔ "قائدِ اعظم کبھی سیکولرزم کے حامی نہیں رہے اور قیامِ پاکستان کے بعد ان کی جس تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ دستور ساز اسمبلی میں ہوئی تھی اور میں خود اس میں موجود تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ "آزاد مُلک کے شہری کی حیثیت سے ہر ایک کے حقوق برابر ہیں چاہے آپ کسی بھی مذہب کے پیروکار کیوں نہ ہوں اس بنیاد پر دستور میں کوئی ایسی شق نہیں ہو گی جس سے کسی کو نقصان پہنچے"۔ ("دو قومی نظریہ کے حامی عُلما اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی" ص ۲۹) خواجہ رضی حیدر، سورتی اکیڈمی

۲۔ شاہراہِ پاکستان

طور پر منصۂ شہود پر آئی تھی :-

" ہم ہندو اور مسلمان، ہر چیز میں ایک دوسرے سے
مختلف ہیں۔ تہذیب و تمدن میں مختلف ہیں۔ تاریخ
میں، زبان میں، طرزِ تعمیر میں، موسیقی میں، قانون
اور اصول قانون میں، کھانے پینے میں، معاشرت
میں، لباس میں غرض ہر چیز میں ہم ہندوؤں سے
مختلف ہیں۔ صرف دوٹ ڈالنے کی صندوقچی میں
ہندو اور مسلمان یکجا نہیں ہو سکتے "۔

گویا چودھری صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قائد نے وداع کے وقت
ان " اقلیتی نمائندوں " کے توسط سے اسلامیان ہند سے کہا " کیوں۔ کیسی رہی؟"
گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ قائد نے خود کو منزل تک پہنچانے کے لیے
مسلمانانِ ہند کو بڑی دانشمندی سے بطور سیڑھی کے استعمال کیا کہ فصیل پر چڑھتے ہی بقیہ
پیچھے آنے والوں کا احساس کیے بغیر سیڑھی واپس صحن میں پھینک دی ۔ پیچھے چڑھنے
والے جو کوئی ابتدائی درجے یا درمیان میں یا قریب تھے سب کے سب اس سیڑھی
کے نیچے دب گئے ـــــ ہزاروں ـــــ لاکھوں افراد ـــــ
مرد ـــــ عورت و بچے ـــــ جوان اور بوڑھے ہلاک ہو گئے۔
۱۱ اگست ۴۷ کو ووٹ ڈالنے کی صندوقچی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یوں اکٹھا
کر دینا انھیں پسند نہ آیا۔

گویا چودھری رحمت علی[7] بانیٔ اسمِ پاکستان " کے الفاظ میں یہ " ملت سے
غداری " تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنے ۱۹۴۸ء کے اُس پمفلٹ میں کیا تھا
جو انھوں نے

"THE GREAT BETRAYAL OF THMILLAT"

کے نام سے لندن سے شائع کیا تھا۔

۱۱ اگست ۴۷ء کی اسی "الٹی گنگا" تقریر کی نسبت چودھری خلیق الزماں نے لکھا:۔

"یہ واضح اور روشن تبدیلی ہمارے سیاسی مسلک میں ایسے
وقت آئی جب کہ لاکھوں مسلم جانیں جا چکی تھیں اور
لاکھوں کی نوبت آرہی تھی اور اس سے زائد یہ کہ لاکھوں
خاندان اور افراد اپنے آبائی وطن اور ماحول کو خیر باد کر کے
پاکستان کی طرف چل پڑے تھے ——— !

کہاں کا مغربی بنگال اور کدھر کا مشرقی پنجاب ——— قائد کے دلّی سے روانہ ہوتے ہی "اسلامیانِ ہند زندہ باد" کو دھکا دیکر "کھوٹے سکّے" حصولِ اقتدار و حصولِ جائیداد کے لیئے ایک پر ایک گرتے پڑتے پاکستان بھاگ پڑے۔ کروڑ ہا اسلامیانِ ہند کی سلامتی کا موثر بندوبست کیئے بغیر انھیں ہندوستان کا وفادار شہری رہنے کا مشورہ دے کے بے یار و مددگار چھوڑ آنے کا جو نتیجہ نکلا اس پر آج آپ اور ہم سب خون کے آنسو روتے ہیں۔ اللہ اُن کی روحوں کو طمانیت بخشے اور اُن کی قبروں کو اپنے نوُر سے منوّر کر دے جنہیں مر کے بھی قبر میسر نہ ہو سکی۔

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

۱۴ اگست ۴۷ء کو جب پاکستان میں یہ "لیڈرانِ قوم" یہ قائد کے "کھوٹے سکّے" دھڑا دھڑ حلف اُٹھا کر عہدوں کا چارج لینے اور ایک دوسرے کو "مبارکباد" دینے، لاکھوں مسلمانوں کے قتلِ عام اور خواتین کی عصمت دری کے غم میں ڈنر کھانے میں مصروف تھے دل گرفتہ، آبدیدہ قائد ایوانِ صدر کی کھڑکی میں کھڑا دور ———

واگہ کے اُس پار ــــــــــ آگ و خون سے برستے بادل کو دیکھ رہا تھا جس کی آہوں اور دل خراش چیخوں کی گرج اور خرمنِ انسانیت کو تباہ کرتی بجلیوں کی چکاچوند کے کچھ حصے کو ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کے سیاسی افق پر انسانی پنجے کے روپ میں ابھرے ہوئے لارڈ کیننگ نے پہلی بار لندن میں دیکھا تھا اور اب جس نے پھیل کر پورے ہندوستان کو نہ صرف اپنی گرفت میں لے لیا تھا بلکہ جس کی بند مضبوط مٹھی سے لاکھوں مسلمانوں کا خون نکل کر" کالی " کے قدموں میں جمع ہو رہا تھا۔ کوئی شک نہیں، ماؤنٹ بیٹن نے اپنی دھمکی کو پورا کر دکھایا ــــــــــ!

وجوہات خواہ کچھ رہی ہوں، چودھری خلیق الزماں نے یو۔پی میں اور حسین شہید سہروردی نے بنگال میں بدترین قتلِ عام کو رکوانے کی ممکنہ کوششیں کیں۔ ایک نے ابوالکلام کو پکڑا تو دوسرے نے " مہاطمع " کی لنگوٹی تھامی اور "امن، امن شانتی، شانتی " کی گردان کرتے ہوئے اپنے نمبر بڑھوانے اور مہاطمع کے نورِ نظر بننے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

ایک تو بنیا کسی کو مارتا ہی نہیں، اور اگر مارتا ہے تو ایسی جگہ جہاں آدمی پانی بھی نہ مانگے۔ جلد ہی " مہاطمع " کو انہیں " اشوک چکر " سے چکر دینے کا موقعہ ہاتھ آ گیا جب " سندھی اقلیتوں پر نام نہاد مظالم اور سندھ سے بیدخلیوں " کے مہاطمعائی پروپگنڈے کے جواب میں گورنر سندھ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے مہاطمع کو دعوت دی کہ وہ خود آ کر سندھ کا دورہ کریں اور اقلیتوں کی مطمئن زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو مہاطمع کو اپنی پول کھلتی نظر آئی۔ اگلی قلابازی کی گنجائش رکھتے ہوئے، بجائے خود ایک طرف شہید سہروردی کو " امن مشن " دیکر کراچی بھیج دیا تو دوسری طرف " رام بھلی کرینگے " کا دلاسہ دیکر چودھری خلیق الزماں سے ۱۸ ستمبر کو سر ظفر اللہ خان کے ۱۶ ستمبر ۴۷ء کے بیان کے جواب میں پاکستان کے خلاف بیان دلوایا جسے " جواب آں غزل " کے طور

پر آل انڈیا ریڈیو اور پاکستان دشمن غیر ملکی لابی اور پریس نے خوب ہی اُچھالا۔

موقر " ڈان " کراچی، کے مطابق، منگل، ۲۳ ستمبر ۴۷ء کو مسٹر سہروردی "امن مشن" پر کراچی پہنچے۔ اسی شام انہوں نے سندھ گورنمنٹ ہاؤس میں شیخ غلام حسین ہدایت اللہ سے سفیر ہند کی موجودگی میں پاکستان کے وزیر اقلیتی امور جوگندر ناتھ منڈل اور دیگر وفاقی و صوبائی وزراء و اعلیٰ حکام سے "امن مشن" کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تین گھنٹے تک مذاکرات کیئے۔ مسٹر سہروردی نے وضاحت کی کہ " وہ بحیثیت مسٹر گاندھی آئے ہیں تاکہ صورتِ حال کی نسبت کچھ مشورے دے سکیں اور کچھ اُن کے نکات اُن تک پہنچا سکیں "۔

جمعرات، ۲۵ ستمبر ۴۷ء کی اشاعت میں " ڈان " نے اپنے صفحہ اوّل کالم (۲) پر اطلاع دی کہ مسٹر سہروردی نے بعد دوپہر نوّے منٹ تک قائداعظم سے تبادلۂ خیال کیا اور براہ کلکتہ نئی دہلی روانہ ہو گئے۔ تاکہ ۲۸ ستمبر ۴۷ء کو کلکتہ میں منعقد ہونے والے کانگرس اجلاس کے دوران " رپورٹ " پر نظرِ ثانی کرکے اکتوبر کے پہلے ہفتے میں " مہاطمع " کی آشیرواد حاصل کر سکیں۔

جس گاندھی نے قائد کو اپنا باپ نہ کہا ہو وہ اِن پڑوسیوں کو چچا کیسے کہتا۔ چنانچہ کراچی سے واپسی پر " سہروردی رپورٹ " وصول ہوتے ہی موقعہ کو غنیمت جان کر " شیواجی " نے اپنے مخلص " افضل خان " کا پہلے پیٹ پھاڑنا طے کر لیا۔

" سانپ مرے گا یا سانپ کو مارنے والا مسلمان مرے گا " کے بنیادی برہمنی اصول کے تحت " راجہ نل " نے چودھری صاحب کی " دروپدی " بھی ہتیالی اور جمعہ ۳ اکتوبر ۴۷ء کو " مہاطمع " نے پھر اپنے ترجمان شہید سہروردی کو " امن مشن " پر کراچی بھیج دیا اور بطور پاسبانِ عقل چودھری صاحب کو بھی " چانکیہ راکھی " باندھ کر ہمراہ کر دیا۔!

دونوں "مہاطماتی کیوپڈ" معناح کا نشانہ لئے ہوئے کراچی پہنچے۔
چودھری صاحب نے مجموعی حیثیت سے جن تاثرات کا اظہار کیا وہ کچھ یوں ہے :-

"میں ۲ر اکتوبر کو تین بجے شام کراچی پہنچ گیا اور اسی دن شہید سہروردی جنرل اسمے (ISMAY) کے ساتھ کراچی پہنچے۔
میں نے کراچی پہنچتے ہی گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کو مطلع کر دیا اور ان سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ تین دن بعد ———— ۵ر اکتوبر کو گیارہ بجے مجھے باریابی کا موقعہ ملا اور ملاقات کے وقت شہید سہروردی بھی موجود تھے"۔

شاہ راہ پاکستان کی اس "پرخار مہم" کے متعلق جس نے چودھری صاحب کے سیاسی پیرہن کو تار تار کر کے ان کی سیاسی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے اپنی آمد کی تاریخ ۳ر اکتوبر کے بجائے ۲ر اکتوبر کیوں دی ہے اور یہ کہ ذرا ذرا سی بات کو ریکارڈ کرنے والے چودھری صاحب نے اپنی اس اہم آمد پر اپنے خانگی یا سرکاری بلاوے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ جب کہ موقر "ڈان" کراچی نے اپنی اشاعت ہفتہ ۴ر اکتوبر ۴۷ء کے صفحہ اوّل کالم (۳) پر اپنے نمائندہ خصوصی کے حوالے سے "سہروردی اور خلیق الزماں کی کراچی آمد" کے عنوان سے اطلاع دی کہ :-

"مسلم لیگ کے دو ممتاز لیڈر مسٹر شہید سہروردی اور خلیق الزماں یوم گذشتہ (جمعہ ۳ر اکتوبر) ہندوستان سے "امن مشن" پر کراچی پہنچے۔
مسٹر سہروردی جو بوقت موجودہ مسٹر گاندھی کے اشتراک سے "امن مشن" کو لیکر چل رہے ہیں لارڈ اسمے کے ساتھ دہلی سے شام چھ بجے پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ مشن کے سلسلے میں وہ کراچی

ہی ٹھیرے رہیں گے ۔ مسٹر سہروردی نے " پیلیس ہوٹل " میں قیام کیا ہے ۔

چودھری خلیق الزماں لیڈر آف دی مسلم لیگ پارٹی ہندوستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی مسٹر سہروردی سے ایک گھنٹہ بعد اورنیٹ ایرویز کے ذریعہ دہلی سے کراچی پہنچے ۔ انہوں نے نمبر (۱۹) کچہری روڈ پر قیام کیا ہے ۔

دونوں مسلم لیگی لیڈر اپنے قیام کے دوران قائد اعظم اور حکومت پاکستان کے وزراء سے ملاقات کرینگے ۔

" اے ، پی ، آئی " کے مطابق مسٹر سہروردی اپنی واپسی کے بعد مسٹر گاندھی سے طویل بات چیت کرینگے ۔ باور کیا جاتا ہے کہ مسٹر سہروردی اقلیتوں کے تحفظ اور حقوق سے متعلق گفتگو کرنے والے ہیں ۔"

۵ راکتوبر ۴۷ء کو دن کے گیارہ بجے چودھری صاحب اور مسٹر سہروردی نے قائد اعظم سے ملاقات کی ۔ چودھری صاحب کے مطابق :۔

" ۵ راکتوبر کو گیارہ بجے مجھے باریابی کا موقعہ ملا اور ملاقات کے وقت شہید سہروردی بھی موجود تھے ۔ مسٹر جناح ملاقات کے کمرے میں میرا وہ بیان ہاتھ میں لیے ہوئے داخل ہوئے جو میں نے سر ظفر اللہ خان کے اس بیان کے سلسلے میں دیا تھا جو انہوں نے ۱۶ ستمبر ۴۷ء کو لندن سے نیویارک پہنچنے پر دیا تھا اور جسے پریس نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا :۔

" اگر اس نے (ہند نے) مسلمانوں کی جانی قربانی کو ختم نہ کیا

تو پاکستان .U.N.O میں شکایت پیش کرے گا اور اگر اس سے اطمینان نہ ہوا تو حکومتِ پاکستان کو راست اقدام کے لیے غور کرنا پڑے گا۔ (یہاں رُک کر دہ اخباری نمائندوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے) کہ گورنمنٹ ہند نے فرقہ داری فسادات کو روکنے کیلئے کوئی اقدامات نہیں کیئے ۔"

جب اِن سے پوچھا گیا کہ کیا اس کے متعلق کوئی ہدایت پاکستان حکومت کی طرف سے ملی ہیں کہ آپ .U.N.O میں یہ معاملہ پیش کریں؟

تو انھوں نے جواب دیا کہ " ابھی تک نہیں۔ مگر حالات اگر اسی طرح قائم رہے اور اگر فوری اقدامات انڈین ڈومینین کی طرف سے اس بدنظمی کے انسداد کے لیے نہ کیئے گئے تو حکومتِ پاکستان کی طرف سے مجھے کسی وقت بھی ہدایت مل سکتی ہے کہ میں .U.N.O میں یہ مسئلہ پیش کردوں کیونکہ یہ امنِ عالم کے لیے بھی ایک بڑا خطرہ ہے۔"

معمولی صاحب سلامت کے بعد انھوں نے ٹھیر ٹھیر کر میرا ۲۰ ستمبر ۴۷ء کا وہ بیان جو میں نے سر ظفر اللہ کے اسٹیٹمنٹ کے جواب میں بحیثیت صدر مسلم انڈیا و لیڈر مسلم لیگی گروپ آف کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی، لکھنؤ سے جاری کیا تھا اور جس پر مجھے کانگریسی لیڈروں نے بڑی داد دی تھی مجھے اس طرح سُنانا شروع کیا جیسے میرا چارج شیٹ پڑھا جا رہا ہو۔

"سر ظفر اللہ نے اپنے ذاتی خیالات کا اس بارے میں
اظہار کیا ہے کہ "پاکستان گورنمنٹ بالآخر مجبور ہو جائے گی
کہ وہ مسلم اقلیت کو بچانے کی تدابیر اختیار کرے" اور یہ بیان
پنجاب مسلم لیگ کونسل کی تجویز کے بعد آیا ہے جس میں کہا
گیا تھا کہ مسلم نوجوانوں کو ملٹری فوجی تعلیم NATIONAL GUARDS
اس غرض کے لیے دی جائے گی۔ ان باتوں سے پاکستان
کے ہم مذہب مسلمانوں سے ہمدردی کا پتہ لگتا ہے مگر
میرا خیال یہ ہے کہ سر ظفر اللہ نے 'ہندوستانی حالات کا
ایسا بیان دینے سے پہلے' اور وہ بھی 'بلا پاکستان گورنمنٹ
کے احکام کے جائزہ نہیں لیا۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلم اقلیت کو ملک کے اکثر حصوں
میں سخت جانی و مالی نقصانات ہوئے ہیں۔ جس میں
رد و قدح کی کوئی گنجائش نہیں۔ مگر مغربی پنجاب میں بھی
غیر مسلم اقلیت کو بھی نقصانات پہنچے اور وہ بھی وہاں سے
باہر نکل آئی۔ ان طوفانی حالات میں دیکھنا یہ ہے کہ
دونوں حکومتوں کا، حکومت سنبھالنے کے ان چند ہی دن
کے اندر کیا رویہ؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ جو کچھ واقعات و
سانحات ہوئے، دونوں حکومتوں کی ایما و اشارے
پر نہیں ہوئے اور نہ ان کی چشم پوشی سے۔ وزیر اعظم
ہندوستان، پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے حالیہ بیان میں
کہا ہے کہ ان کی حکومت ہونے والے حادثات کا تصور

بھی نہیں کر سکتی تھی اور جو کچھ دِلّی کے متعلق کہا گیا وہی
مشرقی پنجاب پر بھی وارد ہوتا ہے۔ جہاں عرصے تک
کوئی صوبائی گورنمنٹ باقی نہیں تھی اور دن دہاڑے قتل و
غارت کا بازار گرم تھا۔

برٹش گورنمنٹ کا یہ فیصلہ کہ ریڈ کلف ایوارڈ
سے پہلے ملک کی تقسیم کر دی جائے اور تمام اختیارات منتقل
کر دیئے جائیں۔ نہایت بداندیشانہ تھا۔ جب فرقہ وارانہ
بنیاد پر فوجوں کی بھی تقسیم ہونے والی تھی تو اس کو اپنے
۳؍جون کے فیصلے سے پہلے یہ سب کچھ کر دینا تھا یا
کم از کم اسے باؤنڈری کیس کے فیصلے سے پہلے کر لیا گیا ہوتا۔

ان حالات میں جو واقعات رونما ہوئے ان
کی ذمہ داری گورنمنٹ آف انڈیا پر عائد ہوتی ہے۔ نہایت
تکلیف دہ اور دل آزار واقعات ہندوستان میں کانگریس
کی کوششوں کے باوجود پیش آئے۔ پاکستانی مسلمانوں کو
سمجھنا چاہیے کہ کانگریس گورنمنٹ اور کانگریس تنظیم
کی ساری عزت وحیثیت اس داؤں پر لگی ہوئی ہے کہ وہ
مرکز اور صوبوں میں بہرصورت امن وامان قائم کر سکے
اور خود گاندھی جی برابر پُرزور الفاظ میں تلقین کرتے
رہے ہیں کہ آزادی کی کوئی قیمت نہ ہوگی اگر ایک فرقہ دوسرے
فرقہ کے ساتھ ظلم وتعدی کا برتاؤ کرے اور یہ اطمینان
جان ہوتا رہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

اپنی انتھک کوششوں سے اور جان کو خطرے میں ڈال
کر انھوں نے کلکتہ اور مغربی بنگال میں امن و امان
قائم کرایا۔ اگر آج پُرامن زندگی کی بحالی میں کانگریس کی
کوششیں فوری کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو اس کی ایک
بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ غیر کانگریسی ہندو کانگریس پر
معترض ہیں کہ اس نے ہندوستان کے بٹوارے پر رضا
مندی ظاہر کی۔ ہم امید و دعا کرتے ہیں کہ انڈین گورنمنٹ
ملک میں امن وامان قائم کرنے میں جلد کامیاب ہوگی"۔

اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا ——— "خلیق ———
تمہارا یہ بیان تین دن ہندوستان کے ریڈیو پر نشر کیا گیا ——— تین دن"۔
میں نے کہا۔ "مسٹر جناح۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، میں بہرنوع ہندوستان
کی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں مسلمانوں کا لیڈر ہوں اس لیے ہندوستان نے اس کو بڑی
اہمیت دی ہے"۔ مسٹر جناح نے کہا " اس سے ہم کو بہت نقصان پہنچا ہے"۔
میں نے جواب دیا " اپنے نزدیک میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے
فائدے کے خیال سے یہ بیان دیا ہے اور آپ نے بھی اپنے ۶ر جولائی کے
بیان میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی حکومت کے
وفادار رہیں"۔ اس کے بعد ——— وہ شہید سہروردی سے مخاطب ہوئے
جنھوں نے اپنی تجاویز" (جو اُس لنگوٹیا نے اُن کے ہاتھ سندھ سے ہندوستان
جانے والے ہندوؤں کو بہر طور روکنے اور سندھ میں ہی اطمینان سے رہنے کی نسبت
بھیجی تھیں تاکہ اسی طرح کا عمل وہ دیول کا " پرلے درجے کا چالاک، مکار اور زگ زیگ
سیاستدان " وہاں کروانے کی کوشش کرتا) ان کو دکھلائیں۔ انھوں نے ان کو پڑھ کر بلا

کسی تبصرے کے واپس کر دیا اور ——— ہمارا انٹرویو ختم ہو گیا۔"

"**ہمارا** انٹرویو ختم ہو گیا" کے بعد چودھری صاحب نے معلوم نہیں، ۷ اکتوبر کو اپنی اور سہروردی صاحب کی دوسری بار قائداعظم سے نوّے منٹ کی ملاقات اور "تبادلۂ خیال" کو کیوں گول کر دیا، جس کی نسبت موقر "ڈان" "کراچی نے بدھ، ۸ اکتوبر ۴۷ء کی اشاعت کے صفحہ (۵) کالم (۷) پر اپنے نمائندۂ خصوصی کے حوالے سے کہ "مسٹر سہروردی آج دھلی پرواز کر رہے ہیں" اطلاع دی کہ:-

"مسٹر شہید سہروردی اور چودھری خلیق الزماں نے منگل، کے دن دوسری بار قائداعظم سے نوّے منٹ تک ملاقات کی۔

آج بدھ کے دن مسٹر سہروردی دھلی کے لیے "آئی این، اے" کے طیارے سے روانہ ہو رہے ہیں۔ جب کہ چودھری خلیق الزماں مزید تین چار دن قیام کریں گے..."

غالباً ۷ اکتوبر کی اس "ملاقات" کے بعد ہی چودھری صاحب نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے کہ

"ملاقات کے دوران اور واپس آنے کے بعد گھر پر میں اپنے دل میں سنجیدگی کے ساتھ سوچتا رہا کہ آخر جناح صاحب کا اس قصے کے کھڑے کرنے سے مقصد کیا تھا۔ جو پاکستان کے اس وقت حالات تھے اس میں وہ خود مسلم اقلیتوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور میرے نزدیک سر ظفراللہ کا یہ بیان کہ "مجبوراً پاکستان کو راست اقدام کرنا پڑے گا۔ ایک بے معنی اور فضول دھمکی تھی۔ ان حالات میں اگر میں نے ہندوستان کی مسلم اقلیت کی طرف سے ایک مصالحانہ قدم اٹھایا تھا تو

جناح صاحب کا اس پر اعتراض مجھے بالکل حق بجانب نظر آیا۔ خصوصاً جب کہ وہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کو اکثر اپنی گفتگو میں کہہ چکے تھے کہ انھوں نے ان کو رائٹ آف کر دیا ہے پھر رائٹ آف شدہ پانچ کروڑ کی اقلیت اگر اپنی بچت کی کوئی معقول صورت نکالنے کی کوششیں کرے تو ان پر ان کو چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"[1]

گویا اس وقت کے یہ دل شکن حالات کافی نہ تھے۔ (یعنی تقسیم ہند کے نتیجے میں خوں ریزی اور اس پر مستزاد ظفراللہ کا سرکاری بیان) کہ غلام محمد نے وسیم صاحب کو مسٹر جناح کا پیغام بھیجا کہ وہ پاکستان آ کر ایڈوکیٹ جنرل کا عہدہ سنبھال لیں۔ اس دعوت نے ہمارے خاندان کے لیے ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ کھڑا کر دیا۔ ان کے والد محمد نسیم صاحب کی عمر اس وقت تقریباً نوّے برس کی تھی اور وہ تمام اپنے خاندان کو لیکر پاکستان نہیں جا سکتے تھے۔ اس لیے میں نے اپنے بہنوئی مسٹر وسیم سے کہا کہ اس بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے وہ تمام حالات کا جائزہ لیں۔

میں نے ان کو سمجھایا کہ آپ کی تقریباً دس ہزار روپے ماہانہ کی اپنے پیشہ سے آمدنی ہے اور اس کے علاوہ آپ کی لاکھوں کی جائیداد ہے۔ اگر آپ پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل ہو کر گئے تو آپ کو انکم ٹیکس دیکر دو ڈھائی ہزار ماہوار ملجائے گا جس میں آپ کی گزر بسر نہ ہو سکے گی اور آپ کو ہندوستان کی جائیداد سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ وہ اس وقت ضمیر مینشن کے کمرے میں کھڑے ہوئے تھے جو سارے لکھنؤ میں بڑی چوٹی کی جائیداد تھی۔ انھوں نے میری رائے سن کر اس عمارت پر ایک ٹھوکر مار کر کہا کہ "میں چونے اور گارے کے اوپر اپنے عقائد قربان نہیں کر سکتا۔" اس کے بعد میں نے کہا کہ بہتر ہے کہ میں کم از کم غلام

---

(۱) شاہراہ پاکستان صفحہ (۱۱۰۴-۱۱۰۵)

محمد ؒ کو ایک خط لکھ کر تمام حالات سے مطلع کر دوں۔ چنانچہ، میں نے ایک مسودہ تیار کیا مگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔"(۱)

اچھا ہی ہوا جو راضی نہ ہوئے ـــــــــــ چودھری صاحب نے سوچا ـــــــ اور یہ بھی غنیمت ہے کہ میں نے اس شخص کو نہ کبھی قائداعظم کہا اور نہ لکھا ورنہ اُس وقت بڑی جگ ہنسائی ہوتی جب میں نے اس کے بجائے باپو کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے بھارتی شہری ہونے کا اعلان کیا تھا کیوں کہ جس احتیاط سے میں چلتا رہا اس کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ کسی طور وہاں مجھے کھلا ہاتھ مل جائے اور پھر جون میں تو میں مرتے مرتے بچا ـــــــــ کس احتیاط سے اس شخص نے اپنی فولادی استخوانی انگلیاں میری گردن پر رکھدی تھیں جب ہندوستان میں یہ شخص مجھے ڈمی نمائندہ بنا کر فوجکر ہو رہا تھا ـــــــــ مگر میں بھی میں تھا ـــــــ ٹکا سا جواب تھما دیا کہ "بخشو بی بلی مُرغا لنڈورا ہی بھلا" ـــــــــ ہوا یوں کہ:-

> جوُن ۴۷ء کے مہینے میں، ایک دن مسٹر جناح نے مجھ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق بہت دیر تک گفتگو کی اور کہا کہ ان کے جانے کے بعد میں مسلم اقلیت کی مرکزی اسمبلی میں لیڈری قبول کر لوں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اپنا انتخاب ہندوستان کی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں کرا لیا ہے حالانکہ اکثر لوگ مجھ سے مُصر تھے کہ میں بنگال سے پاکستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کیلئے کھڑا ہو جاؤں جس سے واضح ہے کہ

۱۔ شاہ راہ پاکستان صفحہ (۱۰۸۷) "سفارتِ گاندھی" پر آنے سے پہلے۔

میرا ارادہ پاکستان آنے کا نہیں ہے مگر میری لیڈری کا
اب کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ جو کچھ حق مجھے لیڈری
کا اپنی بضاعت کے اعتبار سے ایک وقت حاصل تھا
اُسے میں نے بخوشی مسلمانوں کی خاطر قربان کر دیا ہے (۱)

ادھر بروز ہفتہ، ۱۱ اکتوبر ۴۷ء، اپنے صفحہ (۵) کالم (۳) پر موقر "ڈان" کراچی نے "سہروردی کی گاندھی سے علیحدگی میں ملاقات" کے عنوان سے فاضل نامہ نگار کی رپورٹ دی :-

"دہلی، ۹ اکتوبر ۴۷ء۔ آج بعد دوپہر پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسٹر شہید سہروردی نے مسٹر گاندھی سے تقریباً ایک گھنٹہ علیحدگی میں ملاقات کی۔ باور کیا جاتا ہے کہ مسٹر سہروردی نے اپنے "امن مشن" کے سلسلے میں دورۂ پاکستان اور اقلیتوں کے امور کے بارے میں مسٹر جناح اور وزراء مملکتِ پاکستان سے کی گئی گفتگو سے اُنہیں آگاہ کیا۔"

لگتا ہے کہ سہروردی کے رخصت ہونے کے بعد جب گاندھی اور پنڈت نہرو تنہا رہ گئے تو دیول کے "پرلے درجے کے چالاک زِگ زیگ سیاستداں" نے فوری طور پر اپنے "کسی اہم فیصلے" سے پنڈت نہرو کو آگاہ کیا ——— !!

معلوم ہوتا ہے ۸ اکتوبر سے ۱۲ اکتوبر کی درمیانی مدت میں چودھری صاحب کو ایسا کوئی زبردست صدمہ پہنچا یا دھچکا لگا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے تین چار دن میں واپسی

---

(۱) "شاہراہِ پاکستان" صفحہ ۱۰۵۵۔ ان "بخوشی قربان" ہونے والوں میں نواب اسماعیل (آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے جونیئر رکن)، مولانا حسرت موہانی، مسٹر عزیز احمد خان، نواب قزلباش، مسٹر رضوان اللہ، بیگم اعجاز رسول، وغیرہم بھی شامل ہیں۔ بعد میں ان میں سے ہر ایک نے یا تو ذلت و خواری کی زندگی بسر کی یا بھاگ کر پاکستان آ گئے۔
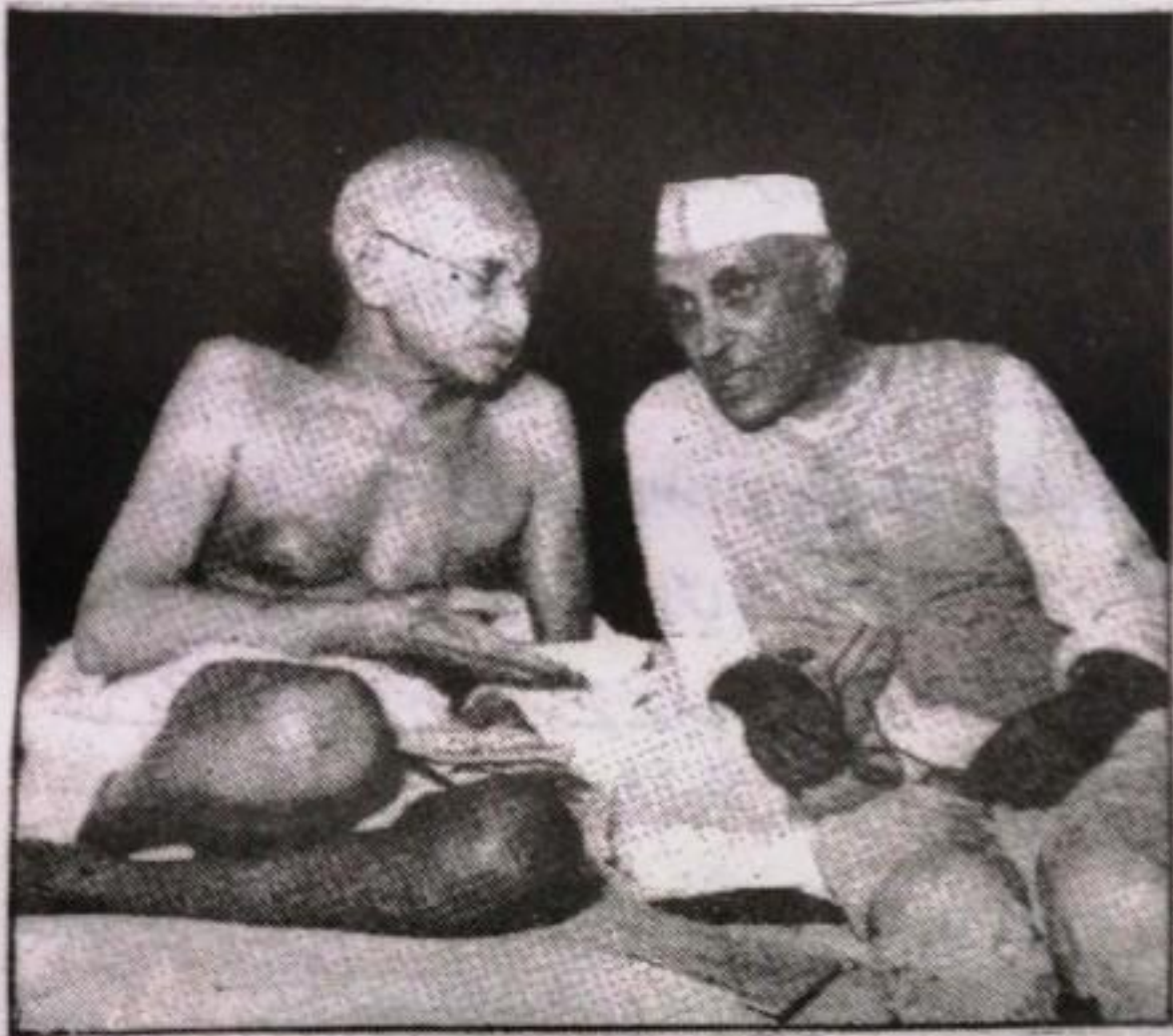
مسٹر گاندھی جواہر لعل نہرو کو اپنے کسی اہم فیصلے سے آگاہ کر رہے ہیں۔
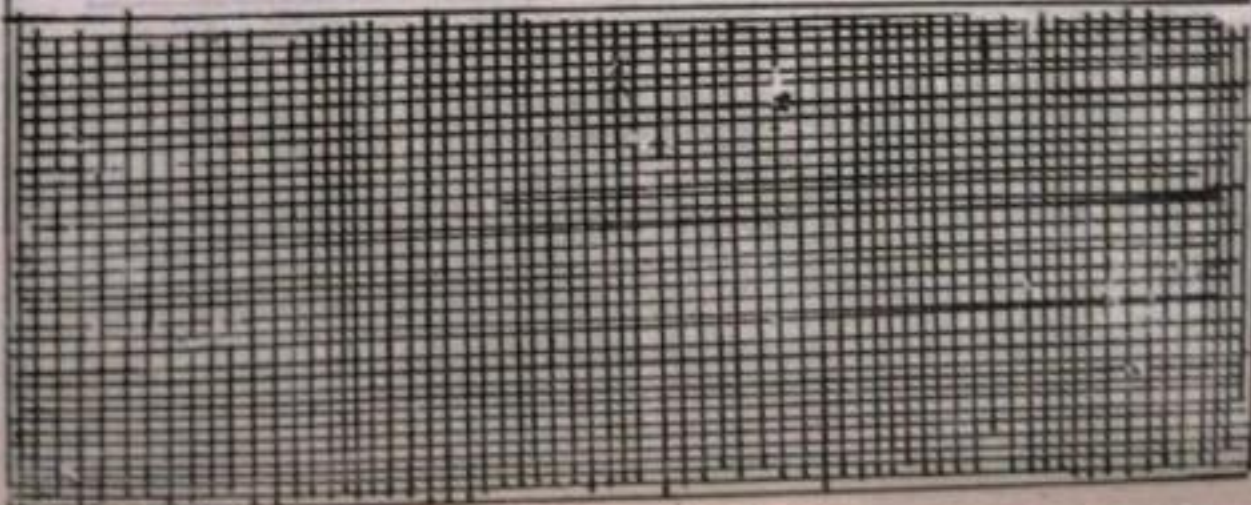
ہند کے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے سے ہمیشہ کے لیے لاچار ہو گئے جس کی بنا، پر انھیں یقین تھا کہ ہندواپسی پر جلد یا بدیر سہی وہ "سیکولر بھارت" کے "سیکولر صدر" ہو جائیں گے[1] لیکن جلد ہی انھیں مہاتما کی "مہا طمعانی" کی نسبت دیول ریمارکس کی صداقت کا یقین ہوا۔ "پرلے درجے کا چالاک، مکار اور زگ زیگ سیاستداں ہے۔" دوسری بار افضل خان، شیواجی معانقہ کے بعنے معلوم ہوئے اور پھر خسرو دکن نظام الملک آصف جاہ کے قول کی سچائی کا علم ہوا کہ "برھمن چاہے کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اس لائق ہوتا ہے کہ پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا جائے"۔

چودھری صاحب کی خاک سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ "امن مشن" کے سلسلے میں اپنی پاکستان تشریف آوری پر ہنسیں کہ روئیں ——— ان کی حالت ایک ایسے "نظمی چوہے" کی ہوگئی جس کی شریانیں "اشوک چکر" سے کاٹ دی گئی ہوں "بندے ماترم" کی تیز دھن پر کسی نے ایسی نظم نہیں سنی ہوگی جو ان کے کانوں کو سنائی دی:-

پانچ چوہے گھر سے نکلے	کرنے چلے شکار
ایک چوہا رہ گیا پیچھے	باقی رہ گئے چار[۴]
چار چوہے جو رہ گئے باقی	لگے بجانے بین
ایک چوہے کے پڑ گیا پھندا	باقی رہ گئے تین[۳]
تین[۳] چوہے جو رہ گئے باقی	کرنے لگے تکرار
ایک چوہے نے بات نہ مانی	باقی رہ گئے دو[۲]

(۱) ۱۹۸۰ کی برسی کے موقعہ پر محترم ہاشم رضا صاحب نے چودھری صاحب کی "خاک شدہ آرزو" کی یوں تعزیت کی:- "اگر چودھری خلیق الزماں ("امن مشن" پر) پاکستان آنے کے بجائے ہندوستان ہی میں رہتے تو ڈاکٹر ذاکر حسین سے بہت پہلے انھیں ہندوستان کا صدر جمہوریہ بنا دیا جاتا"۔ ! (بریکٹ میں اضافہ میرا ہے)

دو چوہے جو رہ گئے باقی   ایک تھا اِن میں نیک
نیک چوہے کو کھا گئی بلّی[1]   باقی رہ گیا ایک

پھر اگلے دن، جب یہ "باقیات وصالحات" صاحب باریاب ہوئے تو ایک مسوداتی کمیٹی کے سینئر رکن اور مسلم لیگ کے مشفق صدر کے درمیان عظیم مملکت اسلامیہ کا باجبروت گورنر جنرل حائل ہو چکا تھا ـــــــ وہ گورنر جنرل جو سرسید کا حاصل، حالی کی مناجات ـــــــ بہادر یار جنگ کی عمرِ مستعار اور اقبال کا صلۂ سحرگاہی تھا ـــــــ وہ بابائے قوم جو اِن گنت عصمتوں کی بھینٹ، آٹھ لاکھ سروں کے کلۂ مینار کی برجی اور ملک کے نو کروڑ انسانوں کا مجسمۂ آزادی تھا، جو اسلامیانِ پاکستان تو پاکستان اسلامیانِ عالم کے لیے بھی منارۂ نور تھا، جو چودھری صاحب تو چودھری صاحب عالمی سیاستدانوں اور مہاتمائی میتھولوجی کے بھی آرپار دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور ایک چودھری صاحب ہی کیا دیدہ وَر قائد کے سامنے ہر شخص ٹرانسپرنیٹ تھا ـــــــ ہر شخص!

کمرے میں قدم رکھتے ہی چودھری صاحب نے سرد پذیرائی کو محسوس کر لیا کہ اب دونوں کے درمیان ایک فلیگ لگی میز اور ریوالونگ چیئر کا نہیں بلکہ خود پرستی تو خود آگاہی کا فاصلہ ہے۔ ایک ایسا فاصلہ جو شرق و غرب کے درمیان ہے۔ ایک ایسا نقطہ جو رجیم کو رحیم سے دور کرتا ہے ـــــــ پھر اُنہیں کوئی ٹھنڈی سی چیز ریڑھ کی ہڈی سے اُوپر کو سرایت کرتے محسوس ہوئی اور اب جو وہ بولے تو اپنی آواز بھی اُنھیں دور سے آتی محسوس ہوئی:۔

"اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو میرا بیان ناپسند ہے اس لیے میں کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی سے یہیں سے اپنا استعفیٰ

---

(1) بعد کچھ عرصے کے "پیشواجی" نے "نیک چوہے" سے بھی معانقہ فرمایا۔!

بھیج دوں گا اور ہندوستان واپس نہ جاؤں گا۔ تاکہ
کوئی دوسرا اس بار کو اٹھائے جس کو آپ کا اعتماد بھی
حاصل ہو اور مسلمانوں کی خدمت بھی کر سکے۔"[1]

ابتدا ۲ جون کے رویہ اور ۵، ۷ راکتوبر کی گفتگو کی روشنی میں قائد نے اس سیاسی پنڈولم کو دیکھا اور پھر مونوکل لگا کر توجہ اس کاغذ پر مرکوز کر دی جو کابینہ کی منظوری سے دستخط کے لیے پیش ہوا تھا۔ پھر ریوالونگ چیئر اس انداز سے دائیں رُخ گھومی کہ چودھری صاحب کے زمین و آسمان گھوم گئے یہ گویا اختتام ملاقات کے ساتھ معلم الملوک کے عہدے سے ان کی تنزلی کا اشارہ تھا!

واپسی میں چودھری صاحب نے یوں محسوس کیا جیسے پہلی بار خُلد بریں سے خاکِ زمین پہ اُتر آئے ہوں۔ جیسے لاکھوں شہیدوں کی لہو ٹپکتی انگلیاں ان پر اٹھ رہی ہوں، جیسے عقب میں "مصلحت" کا عفریت عصمت مآبوں کے خونچکاں بدن لہراتا قہقہے لگا رہا ہو ——— وہ لفظ مصلحت کہ جو ۲۳ ر مارچ کی قرارداد کے "تیور" کے بجائے اس کی پیش سازی کا روڑا بن جاتا تو وقتی طور پر وکیل خلیق الزماں کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ضرور کر دیتا لیکن اسلامیانِ ہند کو ایک "کرم خوردہ پاکستان" اور ایک "کلّہ مینار" کی تعمیری اذیت سے ضرور بچا جاتا۔

شاید چودھری صاحب اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ وقتی طور پر زمانہ اُن کو فراموش تو کر سکتا تھا لیکن تاریخ اپنے اُن نسخوں کو کبھی نہیں بھولتی جو کھاد

۱۔ شاہ راہِ پاکستان صفحہ ۱۱۰۴-۱۱۰۵ ۔اور ملاحظہ ہو ضمیمہ (۲) مولفہ جناب منظور احمد

بن کر زمین میں جذب ہوتے اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں جو مٹی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں۔ جو خود فنا ہوتے ہیں اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتے ہیں جو ایسے بنیاد کے پتھروں کا کام دیتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔"[1]

ہاں البتہ تاریخ اُن کو کبھی معاف نہیں کرتی جو "کم ظرف" اور "چرب زبان" ہوتے ہیں جو اپنی "مصلحت" کی خاطر سفینۂ نوح کی ابتلا پر عافیت کے پہاڑ کو ترجیح دیتے ہیں" جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہِ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہیں جو شجرِ ملت میں پھول بن کر چمکنا اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہیں۔ "وتعزّ من تشاء" سے "وتذلّ من تشاء" کی جانب ایسی عبرت انگیز مراجعت کی کوئی اور مثال تاریخِ پاکستان پیش کرنے سے قاصر ہے جس پر سومناتھ نے بھی تبرّا بھیجا ہو۔ ۶ جنوری ۴۸ء کو لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں ہزاروں افراد کے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے "باپو" کے قاتل سردار ولبھ بھائی پٹیل نائب وزیراعظم بھارت نے کہا کہ:-

"پاکستان کا بنوانے والا اسی شہر کا باشندہ تھا بھگوان کی دیا سے وہ پاکستان چلا گیا ہے۔ ہم خوش ہیں"۔[2]

اسی سال ۴۸ء میں ——— بانیٔ اسمِ پاکستان چودھری رحمت علی کے دردناک انجام کا ذکر کرتے ہوئے چودھری صاحب نے لکھا کہ:-

"۱۹۳۸ء کی لندن، فلسطین کانفرنس کے بعد میری اُن کی ملاقات ۱۹۴۸ء میں لاہور میں ہوئی جہاں اُنھوں نے

۱- نواب بہادر یار جنگ
۲- شاہراہ پاکستان صفحہ ۱۱۳-

مجھے ایک بہت بڑا لنچ دیا تھا جس میں شہر کے اکثر زعماء
شریک تھے۔ لنچ کے بعد میری ان کی بہت دیر تک
نجی گفتگو ہوتی رہی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی میری
طرح پنجاب و بنگال کی تقسیم سے سخت نالاں تھے۔
اور وہ تو اس کو بہت بڑا فریب کہتے ہیں۔ وہ بہت
دل برداشتہ اور مغموم تھے اور کہتے تھے کہ ان کا "ان
کے وطن (پاکستان) میں سی۔آئی۔ڈی پیچھا کر رہی ہے
اور اِن کی بڑی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ بالآخر عاجز آکر
وہ لندن چلے گئے اور وہاں اُنھوں نے ایک پمفلٹ،

"THE GREAT BETRAYAL OF THMILLAT."

"سخت فریب" یا "ملت سے غداری"

لکھا۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے۔" (۱)

مسٹر جناح سے گفتگو کے بعد —— چودھری صاحب نے لکھا ——
میں نے اپنے اہل و عیال کو کراچی بلوالیا اور اس خیال سے کراچی کی سیاست سے
دور رہوں۔ سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر لاڑکانہ میں منتقل ہو گیا۔" (۲)

بقول مختار مسعود:۔

"بعض آدمیوں کی زندگی میں، بڑائی کا صرف ایک دن
آتا ہے اور اس دن کے ڈھلنے کے بعد ممکن ہے اُن کی

---

(۱)۔ ۳؍فروری ۱۹۵۱۔ لندن۔
(۲) اور پھر "چوہا نظم" کا یوں اختتام ہوا:۔
"ایک چوہا جو رہا تھا باقی، کرلی اُس نے شادی
"بیوی" اس کو ملی رلاکا، یوں ہوئی بربادی"

> باقی زندگی اس بڑائی کی نفی ہی میں بسر ہو جائے۔ بدی اور نیکی
> کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ ایک قدم پیچھے ہٹ
> جائیں تو ننگِ کائنات اور ایک قدم آگے بڑھا لیں تو اشرف المخلوقات
> درمیان میں ٹھہر جائیں تو محض ہجوم آبادی۔"

پھر شاید چودھری صاحب درمیان میں ٹھہر کر ہجوم میں کہیں کھو گئے۔!

ایک تو قائد کی اپنی صحت کمزور تھی کہ کثرتِ کار اور عظیم ذمہ داری نے انہیں اور کمزور کر دیا۔ یہ قائد کی خود اعتمادی تھی اور بہادر یار جنگ کی دعائے عمر درازی کہ قیام پاکستان تک سلامت رہے اور ساری عمر ماؤنٹ بیٹن کے لئے تاسف چھوڑ گئے کہ "اگر میں نے تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل ہی مسٹر جناح کا چیسٹ ایکسرے دیکھ لیا ہوتا تو ملک کبھی تقسیم نہ ہونے دیتا۔" رہی سہی کسر ایک تو تقسیم ہند کے فسادات نے پوری کر دی اور جو باقی بچی اس کی تکمیل "کھوسکون" اور ریڈکلف ایوارڈ نے کر دی۔ ۲۵ رمئی کو قائد تبدیلی آب و ہوا کے لئے کوئٹہ چلے گئے لیکن صحت کی سخت خرابی اور ناتوانی کے باوجود یکم جولائی ۴۸ء کو قائد نے کوئٹہ سے آکر اسٹیٹ بنک کا اس طرح افتتاح کیا کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوا جیسے قائد ہر طرح صحت مند ہیں۔ لیکن تقریب کی گہما گہمی نے تباہ کن اثر پیدا کیا۔ ناتوانی میں مرض نے زور مارا اور قائد زیارت منتقل کر دیئے گئے۔ زیارت، جہاں فوری طبی سہولتیں تو رہیں ایک طرف ضروریاتِ زندگی بھی میسر نہ تھیں اور نہ ہی ایسی سہولتیں فراہم کی گئیں جو ایسے محسن اور گورنر جنرل کے لئے لازم و ملزوم تھیں۔

۲۱ر جولائی کو مادرِ ملت نے پریشان ہو کر لاہور سے ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو زیارت طلب کیا۔ جو کچھ بھی وہاں گزری وہ بھی اُن کہی شرم ناک اور عبرت انگیز داستان ہے جسے کرنل الٰہی بخش نے اپنی کتاب "قائد اعظم کے آخری ایام[1]" مطبوعہ ۱۹۴۹ء میں "کسی غیر مرئی دباؤ" کے تحت

---

(۱) دلچسپ بات یہ ہے کہ قائد اعظم کی "سوانح" بیان کرنے کے لئے سیکری کے ریکروٹ ہیکٹر بولیتھو نے بھی اسی کے حوالوں پر انحصار کیا ہے۔

لکھا ہے۔ چنانچہ زیارت کے آخری ایام میں کراچی سے خصوصی جہاز کے ذریعہ "ایک بہت ہی اہم شخصیت" کی اہم ترین ملاقات کے لئے ریذیڈنسی آمد اور ملاقات پر اصرار و ناکامی کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ اگر انہیں قائد سے ملاقات کی اجازت دے دی جاتی تو اس گفتگو سے قائداعظم کی صحت پر بُرا اثر پڑتا اور وہ شاید اس صدمے سے جانبر نہ ہوتے۔" چنانچہ عقلمند را اشارہ کافی است کے تحت ہی سہی موصوف نے "شخصیت" کا نام چھپاتے ہوئے لکھا کہ :۔

ایک دن مسٹر امین نے آکر ایک بہت اہم شخص کے قائداعظم سے ملنے کی اجازت مانگی جو اسی وقت خاص ہوائی جہاز سے پہنچے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک قائداعظم کی جان سے زیادہ کوئی بات اہم نہیں اور میں کسی کو ان سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مسٹر امین ایک بار پھر یہی درخواست لے کر آئے اور کہنے لگے اس ملاقاتی کو ایک بڑے معاملے میں قائداعظم سے گفتگو کرنی ہے۔ میں نے نام پوچھا تو امین صاحب نے کہا کہ یہ راز کی بات ہے اور میں اسے افشا نہیں کر سکتا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد جب مجھے ان صاحب کا نام معلوم ہوا تو میں نے بڑا شکر کیا کہ ملاقات نہ ہونے دی ورنہ اس گفتگو سے قائداعظم کی صحت پر بُرا اثر پڑتا اور وہ شاید اس کے صدمے سے جانبر نہ ہوتے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات سے سیاسی حالات کی رفتار پر کیا اثر پڑتا ...."

اس دل ہلا دینے والے انکشافی بیان سے ـــــ پوری احتیاط کے باوجود ـــــ یہ بدگمانی پیدا ہونے کی قدرتی وجہ موجود ہے کہ وہ "بہت اہم شخص" ـــــ وہ پر اسرار اجنبی کراچی سے کوئی بہت ہی اہم میسج ـــــ شاید قائد کی عہدہ گورنر جنرلی سے علیحدگی کی

قائد زیارت میں "زیر علاج"

"تم" جو احساں نہ کرتے تو احساں ہوتا "

اطلاع تعمیل کرنے آیا تھا اور یہ کہ اصرار کے باوجود ملاقات کا موقعہ نہ دینے پر اس کی واپسی کے فوری بعد کراچی نے یکطرفہ غائبانہ عملدر آمد کرکے قائد کو اُن تمام مراعات سے محروم کر دیا جو ایک گورنر جنرل کے عہدے کا لازم و ملزوم جزو ہیں۔

پیش آمدہ صورتِ حال کی نسبت ڈاکٹر الٰہی بخش صاحب نے نہ صرف یہ کہ قائد ہی کو پراسرار اجنبی کے بارے میں اطلاع نہیں دی بلکہ مادرِ ملت کو بھی آگاہ نہ کیا۔ کوئٹہ سے کراچی روانگی کے وقت ایجنٹ گورنر جنرل اور سینئر سول و ملٹری آفیسر ز کا غائب رہنا۔ کوئٹہ ایرپورٹ پر مسلح افواج کا الوداعی آنر نہ دینا۔ گورنر جنرل کے خاص جہاز کے بجائے صرف ایک تھرڈ کلاس ٹوٹے کی آمد۔ ماری پور کے ہوائی اڈے پر وزیر اعظم کی بمعہ کابینہ عدم موجودگی۔ مسلح افواج کے تقدیمی آنر سیلوٹ کے ساتھ ساتھ جی، جی میڈیکل اسٹاف کی عدم موجودگی اور نرس تک کے لاپتہ ہونے اور محض ایک ناکارہ۔ بظاہر کسی خیراتی ادارے کی ایمبولینس کی موجودگی، پھر راستے کی صعوبتیں اور انتقال تک کی شرمناک عدم توجہی کیا کسی برسر اقتدار گورنر جنرل کے ساتھ ممکن ہونے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے یا صرف۔ مسٹر جناح بھی نہیں ——— "جینا پونجا" کے ساتھ؟

چنانچہ جاں بلب قائد ——— "بابائے قوم" ——— کے اس آخری المناک سفر اور دمِ آخر تک کی صعوبتوں کی نسبت جو انہوں نے اپنے ہی تخلیق کردہ پاکستان میں کوئٹہ سے دارالحکومت، اور ماری پور سے بسترِ مرگ تک برداشت کیں (جس کے دائیں، بائیں اور سرہانے ایک بہن اور صرف تین ڈاکٹروں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا) کرنل موصوف نے لکھا کہ:۔

"...... پھر ان کی نازک حالت کا خیال کرکے ہم نے
محترمہ فاطمہ جناح کو مشورہ دیا کہ انہیں کراچی لے جانے کے لئے

---

(۱) مسٹر فرخ امین۔ قائد اعظم کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری

گورنر جنرل کا خاص ہوائی جہاز کوئٹہ میں تیار رہنا چاہیے چنانچہ
یہ حکم کراچی پہنچا دیا گیا اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ دو اور
ہوائی جہاز سامان اور اسٹاف کو لے جانے کے لئے پہنچ رہے
ہیں .... یہ بھی انتظام کیا گیا تھا کہ میں اور ڈاکٹر مستری
قائداعظم کے ہمراہ سفر کریں اور ڈاکٹر شاہ اور ان کے بیوی
بچے دوسرے جہاز میں اسٹاف کے ساتھ روانہ ہوں۔"

لیکن بہت جلد کرنل صاحب کی خوش فہمی دور ہو گئی۔ گورنر جنرل کا خاص طیارہ تو رہا ایک طرف مزید دو میں سے صرف ایک ـــــ غالباً سروس ڈکوٹا میڈیکل اسٹاف، حتیٰ کہ آرام دہ اسٹریچر کے بغیر کوئٹہ پہنچا[1]۔ جہاز کی وسعت اور سہولیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے لکھا کہ:۔

"....... انجن کے ساتھ والے کمرے میں چار سیٹیں تھیں جن
میں سے دو کھل کر بستر کا کام دے سکتی تھیں۔ قائداعظم کو اسی
بستر پر لیٹنا تھا۔ کیبن میں اگرچہ آکسیجن دینے کا سامان لگا
ہوا تھا لیکن آکسیجن بہت تھوڑی مقدار میں تھی اور بمشکل
آدھ گھنٹہ کام دے سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے ارادہ کیا کہ احتیاطاً
ایک آکسیجن سے بھرا ہوا سلنڈر ملٹری ہسپتال سے منگوا لیا جائے
اسٹریچر جہاز کے دروازے سے بڑا تھا، اس لئے ہم نے
رسیوں سے کھینچ کر اسے چھوٹا کیا .... اس کے بعد میں نے
محترمہ فاطمہ جناح سے پوچھا کہ کیا رات کی نرس کو ساتھ لے چلیں

---

(1) پاک فضائیہ کے قائم مقام کمانڈر۔ اِن چیف اے کے جنجوعہ نے کہا کہ " تاہم مجھے یہ مزید معلوم ہے کہ گورنر جنرل کا مخصوص اور ذاتی طیارہ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔"

گی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ ہمیں کراچی میں نرس مل جائے گی اور اس
کا انتظام کر لیا گیا ہے کہ ایک ایمبولینس اور نرس ماری پور کے
ہوائی اڈے پر موجود ہو۔

...... ہوائی جہاز کے اندر کافی گرمی تھی...... کیبن میں میرے
بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی لیکن میں جوں توں سیڑھیوں پر دروازے
کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ یہ سیڑھیاں دونوں کیبنوں کو آپس
میں ملانے کے لیے لگائی گئی تھیں...... وہ گھبراہٹ کے مارے
اپنا کمبل پرے پھینک دیتے تو مس جناح جلدی سے اسے پھر
اوڑھا دیتیں۔ بیس منٹ تک سیڑھیوں پر سکڑ کر بیٹھنے سے مجھے
ستانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مس جناح نے میری بے آرامی
کو دیکھ لیا اور کہا کہ آپ کچھ دیر آرام کیجیے، اس وقت تک میں خود ہی
آکسیجن دیتی رہوں گی......"

...... چار بج کر پندرہ منٹ پر ہم ماری پور کے ہوائی اڈے پر
پہنچے اور ایک بڑا مشکل بار سر سے اترا۔ جہاز سے نکلا تو گورنر جنرل
کے ملٹری سیکرٹری کرنل نولز[1] نظر آئے۔ وہ ایمبولنس کے قریب
کھڑے تھے لیکن کوئی نرس موجود نہ تھی کراچی میں کسی قدر گرمی تھی
لیکن کچھ ایسی ناقابلِ برداشت بھی نہ تھی کیوں کہ ہوا خوب چل
رہی تھی۔ مگر جہاز کے اندر کافی حبس تھا، اس لئے ہم قائداعظم
کو جلدی سے ایمبولنس میں لے آئے۔ مس جناح اور کوئٹہ والی نرس

---

(۱) بقیہ از چپراسی تا وزیراعظم سب غائب۔

ایمبولنس میں بیٹھ گئیں۔ ملٹری سیکرٹری، ڈاکٹر مستری اور میں گورنر
جنرل کی کار میں سوار ہوئے۔ ملازم سامان کے ساتھ پیچھے ایک ٹرک
میں بیٹھ گئے۔ ہوائی اڈے سے گورنر جنرل کی قیام گاہ نو دس میل ہوگی
ہم اس طرف بہت کم رفتار سے روانہ ہوئے۔

...... بمشکل چار میل گئے ہوں گے کہ ایمبولنس یکایک رک گئی۔
ہم حیران تھے کہ آخر یہ کیا ہوا۔ میں نے باہر نکل کر دریافت کیا تو
معلوم ہوا کہ گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے۔ ڈرائیور نے کہا کہ ابھی
ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ وہ کوئی بیس منٹ تک مصروف رہا لیکن
گاڑی پھر بھی نہ چلی۔ مس فاطمہ جناح نے ملٹری سیکرٹری کو ایک اور
ایمبولنس لانے کے لئے بھیجا۔ ڈاکٹر مستری بھی اس کے ساتھ
ہو لئے۔ ایمبولنس میں ہوا بالکل بند تھی۔ نرس اور نوکر انہیں پنکھا
جھل رہے تھے۔ پھر بھی قائد اعظم کو پسینہ پر پسینہ آ رہا تھا۔ ہمیں
خیال آیا کہ انہیں بڑی کار میں منتقل کر دیں لیکن اسٹریچر اس کے
دروازے سے بڑا تھا۔ وہ خود بھی اتنے کمزور تھے کہ پچھلی سیٹ
پر نہیں لیٹ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے کپڑے پسینہ سے
شرابور تھے اور باہر انہیں ہوا لگ جانے کا خطرہ تھا۔ میں ان کی
نبض دیکھ کر کچھ سہم سا گیا کیوں کہ وہ بڑی کمزور معلوم ہو رہی تھی۔
میں گھبرایا ہوا ٹرک سے فلاسک نکال کر لایا جس میں گرم چائے
تیار تھی۔ مس فاطمہ جناح نے چائے دیتے وقت بتایا کہ قائد اعظم نے
صبح سے سوائے پھلوں کے رس کے اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔
انہیں چائے رغبت سے پیتا دیکھ کر ہمیں کچھ ڈھارس ہوئی۔

ایمبولنس کے بے وقت خراب ہو جانے کے علاوہ ہر چیز مریض کے حق میں دکھائی دیتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر خدانخواستہ قائداعظم نے ہوائی سفر بخیر و خوبی طے کرنے کے بعد سڑک کے کنارے جان دے دی تو یہ کتنا زبردست سانحہ ہو گا۔ بڑے تردد اور تشویش کے عالم میں، مَیں نے ان کی نبض دیکھی اور خدا کا شکر کیا کہ وہ باقاعدہ مضبوطی سے چل رہی ہے۔ چائے کی پیالی سے اُن کی طبیعت کچھ بحال ہو گئی تھی۔ میں گھڑی گھڑی شہر کی طرف نظریں دوڑاتا تھا لیکن ایمبولنس کے کوئی آثار نہ تھے۔ ٹرک اور بسیں اِدھر اُدھر سے گزر رہی تھیں لیکن کوئی بھی اس قابل نہ تھی کہ وہ استعمال میں لائی جا سکے۔ میں بہت حراساں و پریشان بیٹھا تھا۔ بڑے صبر آزما انتظار کے بعد خدا خدا کر کے ایمبولنس نمودار ہوئی۔ ہم نے فوراً قائداعظم کو اس میں منتقل کیا اور پھر روانہ ہوئے۔ ایمبولنس پر گورنر جنرل کا نشان نہ تھا اس لئے کسی کو بھی پتہ نہ چلا کہ قائداعظم اس نازک حالت میں کراچی کے بازاروں سے گزر رہے ہیں

چھ بج کر دس منٹ پر ماری پور کے ہوائی اڈے پر اترنے کے دو گھنٹے بعد کہیں جا کر ہمارا سفر ختم ہوا۔ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مہم سر کر کے ہمیں کتنا اطمینان ہوا۔ اس سفر سے ہم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ سکتا تھا.......... ایمبولنس قائداعظم کے کمرے کے سامنے

ٹھہرائی گئی^ا - وہ اسٹریچر پر اندر لائے گئے...... میں نے کرنل نولز سے کہا کہ کرنل ایم۔ ایچ شاہ کی معرفت رات کی نرس کا انتظام کرائیں اور انیما دینے کا سامان بھی منگا لیں۔ لیکن کرنل شاہ کہیں نہ مل سکے کیوں کہ ان کو قائداعظم کے کراچی پہنچنے کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ پھر ہم نے جناح سنٹرل ہسپتال کے سرجن سعید احمد کو ٹیلی فون کیا لیکن وہ آپریشن میں مصروف تھے اس لئے ان تک رسائی نہ ہو سکی۔ پھر میں خود کرنل شاہ سے ملنے اور نرس ڈھونڈنے نکلا۔ لیکن وہ گھر پر نہ تھے اور نہ ہسپتال تک۔ میں نے یہ نہ چاہا کہ آپریشن میں مخل ہو کر کرنل سعید احمد سے ملوں، بلکہ خود ہی نرسز ہوم گیا لیکن وہاں نہ میٹرن تھی اور نہ کوئی تجربہ کار نرس۔ میں حیران تھا کہ اب کیا کروں۔ ہوائی اڈے سے لے کر اب تک ہر بات مخالف ہو رہی تھی۔ کاش میں مس جناح سے یہ اصرار کرتا کہ کوئٹہ ہی سے ایک اور نرس ساتھ لے چلیں لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کراچی میں نرس کا ملنا اس قدر دشوار ہوگا۔ میں پھر کرنل شاہ کی تلاش میں نکلا۔

---

(۱) کون سے کمرے کے سامنے ایمبولنس ٹھہرائی گئی؟ وہ کمرہ جو ایمبولنس کا ہم شکل اور ایوانِ صدر کے احاطے کے کونے کھدرے میں واقع تھا؟ اس لئے کہ قائد کی زبانی ان کے کمرے کے محلِ وقوع کو کتاب کے صفحہ (۵) پر ریکارڈ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا "آپ جانتے ہیں کہ میرے کمرے تک پہنچنے کے لئے برآمدے سے بڑھ کر اے ڈی سی اور پھر ملٹری سیکرٹری کے کمرے گزرنا پڑتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ یہ راستہ مجھے اسٹریچر پر طے کریں۔"

آٹھ بج چکے تھے لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ ان
کے یہاں ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے ملاقات ہوئی جو اپنے بال بچوں
سمیت ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے کراچی(۱) کو کوس کر اپنا جی
ہلکا کیا۔ کرنل شاہ کے انتظار میں آٹھ بج کر بیس منٹ ہو گئے تو
میں نے کرنل شاہ(۲) سے کہا کہ اب میں چلتا ہوں...... چنانچہ
میں سیدھا گورنر جنرل کے دولت کدہ پر پہنچا اور یہ دیکھ
کر خوش ہوا کہ ملٹری سیکرٹری کو ایک نرس دستیاب ہو گئی!(۳)
ساڑھے آٹھ بجے میں نے لیفٹیننٹ مظہر سے کہا کہ وہ محترمہ
فاطمہ جناح کی خدمت میں اطلاع کریں کہ میں ان سے مل
کر قائد اعظم کی حالت کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں۔
مجھے بتایا گیا کہ قائد اعظم دو گھنٹے سے آرام فرما رہے ہیں۔
پندرہ منٹ کے بعد میں نے ملٹری سیکرٹری سے پوچھا کہ
محترمہ فاطمہ جناح کی خدمت میں اطلاع کی گئی ہے یا نہیں؟
ان کا خیال تھا کہ اطلاع ہو چکی ہو گی۔ لیکن معلوم نہیں جواب
کیوں نہیں ملا۔ پونے نو بجے یہ دیکھ کر کہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک
معلوم ہوتی ہے اور رہیں تھوڑی دیر میں پھر آنا ہے میں
کھانا کھانے کی غرض سے ہوٹل روانہ ہوا۔ جلدی جلدی
کھانا کھا کر ٹیلی فون کرنے کے لئے باہر آیا کہ مجھے لانے کے

---

(۱) غالبؔ "کراچی"۔

(۲) کرنل ڈاکٹر ریاض علی شاہ۔ (۳) "روٹی شوٹی خلاص ـ حقہ پانی بند"!

لئے یہاں کار بھیج دی جائے۔ استقبالیہ کلرک نے عین
اس وقت پیغام دیا کہ فوراً اے، ڈی، سی کو ٹیلی فون کرنے
کے لئے کہا گیا ہے۔ ٹیلی فون پر معلوم ہوا کہ قائداعظم کی نبض
بگڑ گئی ہے۔ میں نے فوراً کار منگوائی اور سوا نو بجے قائداعظم
کی خدمت میں پہنچ گیا۔ ان کی نبض کمزور تھی اور بے قاعدہ
چل رہی تھی اور ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ پیشتر اس کے
کہ اس کی وجہ دریافت کروں میں نے انہیں تیزی سے
دل کی دوا کا ایک ٹیکہ لگایا اور خون کے دوران کو طاقت
دینے والی ایک دوائی پلائی لیکن یہ دوائی ان کے حلق سے
نیچے نہ اتر سکی اور ان کے منہ سے باہر نکل آئی۔ میں نے چند
اینٹیں یا لکڑی کے ٹکڑے منگوانے کے لئے کہا تھا تاکہ ان
کے پاؤں کی طرف چارپائی کچھ اونچی کی جاسکے اور ان کی
ٹانگوں پر لپیٹنے کے لئے پٹیاں بھی منگوائیں تاکہ خون دل و
دماغ کی طرف دورہ کرے۔ وہاں چونکہ ان چیزوں کا
ملنا مشکل تھا اس لئے میں نے خود ہی ان کا پلنگ پائنتی
کی طرف سے اوپر اٹھایا۔ پلنگ بہت بھاری تھا۔ میں
نے اسے کوئی چھ انچ اٹھا تو دیا لیکن ٹھہرا نہ سکا۔ مس جناح
نے میرا ہاتھ بٹانا چاہا لیکن میں نے انہیں تکلیف کرنے سے
روک دیا اور انہیں کچھ کتابیں لانے کے لئے کہا تاکہ اینٹوں

کے بجائے استعمال کی جائیں لیکن ساری کوششوں کے باوجود نبض کی حالت درست نہ ہو سکی۔ میں اسی جدوجہد میں تھا کہ ڈاکٹر مستری اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ پہنچ گئے۔ میں نے ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے کہا کہ وہ رگ میں ایک ٹیکہ لگائیں۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ کو اگرچہ ٹیکہ لگانے میں بہت مہارت تھی لیکن اس وقت چونکہ قائد اعظم کی رگیں کام کرنے سے جواب دے گئی تھیں اس لئے وہ ٹیکہ نہ لگا سکے۔ میرے آنے سے پہلے نرس انہیں آکسیجن دے رہی تھی، اسے جاری رکھا گیا۔ دل کو تقویت پہنچانے کی دوا منہ کے راستے دینے کی ایک اور کوشش کی گئی لیکن وہ بھی حلق سے نیچے نہ اتر سکی۔ ہم بالکل بے بس ہو چکے تھے۔ ایک اور ٹیکہ لگانے کے بعد میں نے اطمینان دلانے کے خیال سے قائد اعظم کی خدمت میں عرض کیا، "جناب! ہم نے آپ کو تقویت پہنچانے کے لئے ٹیکہ لگایا ہے اور جلد ہی اس کا اثر ظاہر ہو گا۔ خدا کو منظور ہوا تو آپ زندہ اور سلامت رہیں گے۔" قائد اعظم نے سر ہلاتے ہوئے بڑی نحیف آواز میں کہا "نہیں، میں نہیں بچوں گا۔" اور یہی وہ آخری الفاظ تھے جو انہوں نے مجھ سے اپنی وفات سے آدھ گھنٹہ پہلے کہے۔ محترمہ فاطمہ جناح کو پریشانی کے

---

(۱) (FOWLER'S BED) تک بھی نحیف و نزار و جاں بلب قائد کو مہیا نہیں کیا گیا۔ (FOWLER'S BED) یعنی مریضوں کے استعمال کیلیے وہ عام فولادی پلنگ جسے نیچے لگے ہوئے کل کے ذریعہ حسب خواہش پائنتی یا سرہانے سے اونچا نیچا کیا جا سکتا ہے۔

مارے اُن سے بات کرنے کا ہوش نہ تھا۔ اس وقت
صرف تین ڈاکٹر، محترمہ فاطمہ جناح اور ایک نرس کمرے
میں موجود تھے۔ دس بجے نبض کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور
ہمیں موہوم سی اُمید ہوئی، لیکن دس ہی منٹ بعد نبض
پھر کمزور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔"

دس بج کر بیس منٹ پر ـــــ مدھم چاندنی رات میں ـــــ چپکے سے چاند نیچے اُتر آیا ـــــ ستاروں کے جھرمٹ میں اسلامی دُنیا کا سہارا، دس کروڑ مسلمانوں پاکستان کا باپ اپنے ناسپاس وحسن کشوں کا داغ لے کر اُن کہکشانی راستوں پر چل پڑا جو سوئے فردوسِ بریں جاتے ہیں ـــــ اب نہ نرگس روئے گی اور نہ دیدہ ور پیدا ہوگا ـــ پھر ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر "مامون" کے چادر اُڑھا دی۔!

۱۲ ستمبر کی صبح سویرے، اقوام عالم کے مختلف گلدستہ ہائے عقیدت میں سب سے حسین گلدستہ پنڈت نہرو کی ہمشیرہ، وجے لکشمی پنڈت، صدر اقوام متحدہ کا رکھا ہوا تھا:۔

"اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی جی اور دو سو مولانا آزاد
ہوتے اور ان کے مقابلے پر کانگریس میں صرف ایک جناح
ہوتے تو ملک کبھی تقسیم نہ ہوتا ـــــ"!

حالات کے ایک رُخ سے پردہ اُٹھاتے ہوئے سابق وزیر قانون و اٹارنی جنرل پاکستان جناب شریف الدین پیرزادہ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو ہفت روزہ "ملت" اسلام آباد کے اس سوال کے جواب میں کہ "کہا جاتا ہے کہ قائداعظم کے آخری ایام کے دوران اُن کے ساتھ شایان شان سلوک نہیں کیا گیا بالخصوص کوئٹہ سے کراچی آمد کے موقع پر اُن کی ایمبولینس خراب ہونے اور انھیں

دھوپ میں فٹ پاتھ پر لٹانے کا قصہ بہت عام ہے۔ آپ کی معلومات اس
ضمن میں کیا ہیں؟ پیرزادہ نے جواب دیا:۔ (۱)

"قائداعظم کے ساتھ اُن کی علالت کے آخری دور میں
واقعی انتہائی افسوسناک سلوک کیا گیا۔ انھیں وہ سہولتیں
بہم نہیں پہنچائی گئیں جو اس ملک کے قومی ہیرو کو مہیّا کی
جانی چاہیے تھیں۔ جب وہ کوئٹہ سے کراچی آئے
تو اُن کے لیے دانستہ طور پر ایک انتہائی ناکارہ ایمبولینس
بھیجی گئی جو راستے میں ہی خراب ہو گئی۔ قائداعظم نے
ڈرائیور سے کہا کہ میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ جس پر انھیں
ایمبولینس سے نکال کر باہر دھوپ میں فٹ پاتھ پر
ایک اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ میں کہوں گا کہ وہ اپنی طبعی موت
نہیں مرے بلکہ انھیں مروایا گیا تھا۔" کس نے مروایا؟
وہ نام لینا کیا ضروری ہے؟ —— پیرزادہ نے کہا۔
ایک پورا ٹولہ تھا جو قائداعظم کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا
تھا۔ یہ لوگ شروع ہی سے قائداعظم کے خلاف سازشیں
کر رہے تھے اور قائداعظم بھی سب کچھ جانتے تھے۔ مثال
کے طور پر لیاقت علی خان نے قیام پاکستان سے کچھ عرصہ
قبل ڈیسائی سے کچھ اُمور پر باتیں کیں تو ڈیسائی نے لیاقت علی خان
سے کہا کہ تم تو مان رہے ہو مگر محمد علی جناح کو کون راضی کریگا۔؟

---

(۱)۔ جنگ۔ کراچی۔ ۱۳ نومبر ۱۹۷۹ء
- ملت۔ صفحہ (۹) ہفت وار اشاعت - ۱۹ ستمبر ۱۹۷۹ء
جلد (۲) شمارہ - ۳۱

لیاقت علی خان نے جواب دیا کہ جناب! جناح مزید سال ڈیڑھ سال
سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ میرے پاس ——
میرے پاس بہت سے حقائق کے دستاویزی ثبوت
موجود ہیں، مناسب موقعہ پر میں ان سب باتوں کے
متعلق مزید لکھوں گا۔" (۱)

لیاقت ڈے کے عین تیسرے دن، ۱۹ اکتوبر ۹۷۹ کی اشاعت میں کثیرالاشاعت "جنگ" کراچی نے فرزند پاکستان جنجوعہ کا بیان شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔

"...... سابق ایرکموڈور ایم کے جنجوعہ نے قائداعظم
کی برسی کے موقعہ پر، اٹارنی جنرل پاکستان شریف الدین
پیرزادہ کے اس انٹرویو پر تبصرہ کیا ہے جس میں انہوں
نے کہا تھا کہ قائداعظم اپنی طبعی موت نہیں مرے تھے
انھیں ایک سازش کے تحت مارا گیا تھا۔ سابق ایرکموڈور
جنجوعہ نے جو ستمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان فضائیہ کے قائم
مقام کمانڈر۔ان۔چیف تھے، کہا کہ میں قائداعظم کی
وفات کے روز یعنی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بحیثیت پاک

---

(۱) ۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی موجودگی میں کراچی سے "ایک بہت بڑی شخصیت" کا فون آیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے فون سن کر قائداعظم کو بتلایا کہ "فلاں صاحب آپ کی صحت کے لیے بڑے فکرمند ہیں۔" یہ سن کر قائداعظم نے فرمایا کہ "وہ تو فکرمند اس لیے ہیں کہ میں ابھی تک زندہ کیوں ہوں۔" (قائداعظم کا کردار۔ ص ۲۸۵)

• فون کرنے والے صاحب قوم کے بہت بڑے لیڈر تھے اور آج تک ان کی خاص امیج ہم نے بنا رکھی ہے۔" (موقر نوائے وقت۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۶ء) کردار قائداعظم ص ۲۸۶

فضائیہ کے قائم مقام کمانڈر انچیف کے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی رہائش گاہ پر ایک کانفرنس میں شامل تھا جو تمام دن جاری رہی۔

. . . . جناب جنجوعہ نے کہا کہ میری حیرت اور غم و غصہ کی وجہ اور تھی۔ کانفرنس پورے دن رہی، وزیر اعظم لیاقت علی خان، جنرل گریسی، اسکندر مرزا، جنرل گیتھروں، وزیر خزانہ غلام محمد، سیکرٹری چودھری محمد علی اور نائب سیکرٹری دفاع اے بی طنقوی سب وہاں موجود تھے۔ لیکن کسی وقت، کسی وقفہ میں بھی قائد اعظم کا ذکر نہ آیا۔ شام کو، کانفرنس ختم ہونے کے بعد میں اور ونگ کمانڈر اصغر خان (ریٹائرڈ ایر مارشل) جو میرے انتظار میں تھے۔ ہم دونوں اسٹاف کار میں ماری پور ایر ہیڈ کوارٹرز کو روانہ ہو گئے۔ کار میں چلا رہا تھا۔ جب ہم آبادی کے باہر مچھیروں کے گاؤں کے سامنے سے گزرے تو سڑک کے کنارے پر ایک ایمبولینس خستہ حالت میں کھڑی تھی۔ میں نے کار کی رفتار کم کی تاکہ پوچھ سکیں کہ ہم کیا مدد کر سکتے تھے۔ لیکن جو شخص ایمبولینس کے سامنے کھڑا تھا اُس نے اشارہ کیا کہ مدد کی ضرورت نہ تھی اور ہمیں آگے بڑھنے کو کہا۔ اب اسٹاف کار کی رفتار بہت سست ہو چکی تھی تو گزرتے وقت اصغر خان نے مڑ کر دیکھا اور حیرت زدہ

لہجہ میں مجھ سے کہا کہ اس میں تو قائداعظم ہیں اُن کا سر
مس فاطمہ جناح کی گود میں ہے۔ میرے خیال میں تو وہ
فوت ہو چکے ہیں۔ میں نے ایک جھلک مڑ کر دیکھا تو
ایسے ہی لگا۔ لیکن ہمیں جانے کا اشارہ دیا جا رہا تھا۔
ہمیں خیال آیا کہ شاید قائداعظم کی کار کے انتظار میں ہوں
گے اور ہم تو پاکستان کے دفاع کی تیاری کے لیے منصوبے
بنانے جا رہے تھے، تو اس وقت کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ ہم
واپس ایمبولینس کو دیکھنے جائیں۔ ہمارے دلوں میں تشویش
ضرور تھی اور جیسے کہ دل ڈوب رہا ہو۔

اسی رات، تقریباً تین بجے، میرے گھر پہ ٹیلی فون
کی گھنٹی بجی۔ اے۔ بی نقوی کی آواز تھی۔ قائداعظم فوت
ہو گئے ہیں۔ ایمبولینس کراچی کے غلیظ ترین علاقہ میں،
قائداعظم کا سر اپنی بہن کی گود میں، اور پھر تمام دن کی کانفرنس
جس میں قائداعظم کا ذکر تک نہ تھا اور میں پاک فضائیہ
کا کمانڈر انچیف تھا اور مجھے اطلاع تک نہیں کہ بابائے
قوم اور گورنر جنرل میرے ہوائی اڈے پر اترے۔ اس وقت
تک ایئر ٹریفک کنٹرول برطانوی فضائیہ کے ہاتھ میں
تھی۔ پاک فضائیہ کا عملہ زیرِ تربیت تھا۔ تاہم مجھے یہ
ضرور معلوم ہے کہ گورنر جنرل کا مخصوص اور ذاتی طیارہ استعمال
نہیں کیا گیا تھا اور ہمارے پاس بہترین ایمبولینس اور میڈیکل
عملہ اور سہولیات موجود تھیں۔ مجھے کسی قسم کی اطلاع نہیں

دی گئی۔ گورنر جنرل کی ذاتی اسٹاف کار موجود تھی۔ ظاہر ہے
اُسے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اُس وقت کے صاحب اقتدار
کی بے حسی اور بدخواہی، نیز سرکشی کا اندازہ لگایا جاسکتا
ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ قائداعظم کو ایمبولینس سے نکال کر فٹ
پاتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ ویسے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ
ایسا کیا گیا ہو۔ اور نہ ہی اُن دنوں، جہاں ایمبولینس کھڑی
تھی وہاں کوئی فٹ پاتھ تھا . . . !(۱)

اگر ایسا نہیں ہے ـــــــــ تو پھر سوال یہ ہے کہ قائد کی ہلاکت میں تعجیل کا باعث کون ہے، وہ پُراسرار اجنبی کون تھا۔؟ بقول مختار مسعود:

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے شخص کو غیروں نے
بھا نگر مان کر نہ دیا اور اپنوں نے مانا مگر سمجھ کر نہ دیا اور
یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس شخص کی تحریک کو بھی
بہت سے لوگوں نے غلط جانا۔ کہنے والوں نے کہا کہ اس
مطالبے کے دو عناصر تھے۔ ایک شخص کی ہٹ دھرمی
اور ایک انبوہ کی فرقہ پرستی۔ کہنے والے یہ بات کہتے
آئے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم
لوگ اس رہنما کو بھول جائیں جس نے نظریۂ پاکستان کے

---

(۱) "راولپنڈی سازش" کے ملزم ایئر کموڈور جنجوعہ کا ۳ راگست ۱۹۸۲ء کو دل کا دورہ پڑنے سے لندن میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت وہ پاکستان کے ابتدائی دور کے متعلق اپنی یادداشتیں قلم بند کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے مندرجہ بیان "یادداشت" ہی کا حصہ ہو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود مرحوم لیاقت علی خان ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء "راولپنڈی سازش" کا شکار ہوئے۔ "تیسری سازش" کے ذریعہ دونوں سازشوں کو دبا دیا گیا۔

بارے میں ("کیا کھویا" معترض کو "کیا پایا" قیمت کا احساس دلاتے ہوئے) کہا تھا کہ :-

"زندگی کا یہ اہم مقابلہ اور تگ و دو جس میں ہم مشغول ہیں صرف مادی فوائد کے لیے نہیں ہے بلکہ رُوحِ ملی کی بقا کے لیے بھی ہے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اس کا کوئی تعلق سودے بازی سے نہیں ہے اور مسلمانوں کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہم اگر اس جدوجہد میں ناکام ہو گئے تو سمجھو کہ پھر سب کچھ ضائع ہو گیا۔ ولندیزیوں کی یہ کہاوت ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہنی چاہیے کہ

"جب انسان دولت کھو دے تو کچھ نہیں کھوتا،
اگر حوصلہ کھو دے تو بہت کچھ کھو جاتا ہے،
آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کھو جاتا ہے،
لیکن
روح مرجائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔"[1]

کوئی شک نہیں، ۵ سے ۶ تک کی یہ کہانی دولت کے کھو دینے، آبرو کے لُٹ جانے، اور روح کے مرجانے کی بھی عبرت انگیز داستانیں سُناتی ہے۔ تاریخ عالم کے بارے میں بقول مختار مسعود لائیڈ جارج کی رائے کارلائل سے ملتی جلتی ہے :-

"یہ خیال بالکل غلط ہے کہ تاریخی واقعات صرف ان
بنیادی اسباب سے ترتیب پاتے ہیں جو ناگزیر ہو جائیں
اور اُن کی نزاکت و اہمیت میں کسی کو دخل نہیں ہوتا۔
دراصل تاریخ کے نازک مراحل اور فیصلہ کن لمحات میں
ایک غالب آ جانے والی شخصیت کا ظہور حالات کے

---

(۱) پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے خصوصی اجلاس کا خطبہ۔ ۲ مارچ ۱۹۴۱ء

رُخ کو برسوں اور نسلوں کے لیے بدل دیتا ہے۔"

اور حالات کے رُخ کو برسوں اور نسلوں کے لیے بدل دینے والی شخصیت صرف اور صرف قائداعظم محمد علی جناح بانیٔ دولت پاکستان کی تھی جس کا بدل ــــ جس کا ثانی سیاستِ عالم کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

بہرحال ــــ "قرار داد پاکستان" کی تحریر و پیش کش کی نسبت میرا خیال ہے کہ یہ اُن مبہم اور کثیرالوجوہ دستاویزات میں شامل ہے جن میں قطعیت سے کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی اور اُن سے بہت بڑے انقلاب کے چشمے پھوٹتے ہیں۔
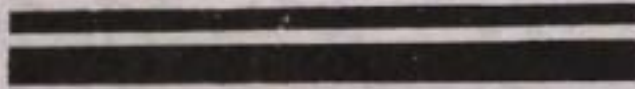
ضمیمہ

"تقسیم پنجاب"

ملک خضر حیات خان نے اس سلسلے میں ۲۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو اپنا ایک بیان سول ملٹری گزٹ لاہور میں شائع کرایا اور بعد ازاں ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء کو انہوں نے دوسرا بیان دیا:۔

"یہ تمام فرقوں کے لیے تباہ کن ہوگا اگر صوبہ پنجاب کے ٹکڑے کر دیے گئے میں نے کچھ ہفتے پہلے پنجاب کی تقسیم کے متعلق اپنا اختلاف پریس کے ذریعہ ظاہر کیا تھا جس کی صحت کے متعلق لوگوں میں شبہات پیدا ہوئے، حالانکہ میں نے اکثر موقعوں پر، اس سے پہلے بھی صوبے کی تقسیم کے خلاف یہ کہا تھا کہ یہ تمام فرقوں کی تباہی کا باعث ہوگا۔ صوبہ پنجاب کی سرحدیں اسے ایک مکتفی، اقتصادی اکائی بنائے ہوئے ہیں۔ اس کا آبپاشی کا نظام اور الیکٹرک سٹی کا نظام اور تمام دوسرے مفاد عامہ کے مستقبل کے پروگرام اگر حصوں میں بٹ گئے تو دونوں، یعنی مغربی و مشرقی پنجاب غربت و افلاس کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ ناقابل تلافی سانحہ ہوگا جس کے نتائج و عواقب کے متعلق ہندو، سکھ اور مسلمانوں کو خواہ وہ مشرقی پنجاب میں ہوں یا مغربی پنجاب میں، غور کرنا چاہیے۔"

ملک فیروز خان نون نے بھی ملک خضر حیات خان کی تائید میں ۶ مئی ۱۹۴۷ء کو ایک بیان شائع کرایا جس میں انہوں نے کہا کہ:۔

"ہم مسلمان پنجاب کی ایک انچ بھی زمین چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں

اگر اس پانچ دریاؤں والے صوبے کو جس کا ایک ہی آبپاشی نظام ہے تقسیم کر دیا گیا تو یہ مستقبل میں جنگ کی بنیاد ڈالنا ہوگا۔ ایک غیر معقول اور غیر منصفانہ امن ہندوستان کے دونوں حصّوں کے اپنے تحفّظ کے لیے مسلح رہنے پر مجبور کر دے گا۔ تمام وہ وسائل جو ہمیں اپنی اقتصادی ترقی کے لیے بہت ضروری ہیں، وہ دفاع کے غیر سود مند اخراجات پر ضائع ہو جائیں گے۔ ہم خطرہ کو اپنی عقل پر غالب نہ آنے دینگے۔ کانگریس نے یہ محسوس کرکے کہ اب تقسیم ہند ناگزیر ہے۔ وہ پاکستان کو قابلِ رہائش ملک بھی دینا چاہتی۔ مگر اُن کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مسلم اپنی آزادی کے لیے ہر شے کو قربان کر سکتا ہے۔"

چودھری خلیق الزماں صاحب نے لکھا کہ:-

"اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہمارے (کُل صوبائی وسعت کے) اس مطالبے کے متعلق انگریز کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ وہ ہندوستان سے جا رہا تھا اور اپنی انگریزی فوج کو وہ ہندوستان میں فرقہ واری جنگ میں چھوڑنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا۔ رہ گئی دیسی فوج، ان میں ہم مسلمان (۳۵) اور (۴۰) فیصد ضرور تھے اور بقیہ (۶۰) فیصدی میں سکھ اور دوسری قومیں تھیں جن کے مقابلے میں ہم ہمیشہ کامیاب ہوئے کیوں کہ وہ لڑائی ایک جہادِ عظیم ہوتی اور دس کروڑ مسلمان اس لڑائی میں کٹ مرنے کو تیار ہوتے مگر اُس وقت بھی ہمیں (صوبائی بنیاد پر مطالبے کی) ہمت نہ ہوئی۔ جس کا نتیجہ بعد میں یہ ہوا کہ تقریباً آٹھ دس لاکھ مسلمان بلا لڑے بھڑے شہید ہو گئے۔" (۱)

---

(۱) شاہراہِ پاکستان۔ بارِ دوم۔ اپریل ۱۹۸۷ء۔ صفحہ ۱۰۳۸ تا ۱۰۴۱۔

بھارت کے اقلیتی صوبوں میں ہونے والے اندازاً (۳۵) ہزار ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور دانشور منظور احمد نے چودھری صاحب کی آمد و منقلاً قیام پاکستان پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے سخت تنقید کی ہے چنانچہ موقر جنگ کراچی کی اشاعت ۷ رجون ۱۹۸۷ء کے صفحہ (۳) پر انھوں نے لکھا کہ :-

"..... بدبخت بھارتی مسلمان جنہیں دو قومی نظریہ والی آل انڈیا مسلم لیگ کی بانی کمانڈ نے اپنا بنا کے اور کام نکال کے غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور مملکت خدا داد پاکستان کے حصول کے بعد بغیر تاخیر و تامل کے بھارت کی ہندو حکومت کے سپرد کر دیا اگر راسخ العقیدہ و صحیح المفکر مسلم ہندی ہونے کی بجائے شمشیر بدست و اسٹنگر بکف مجاہد ہوتے اور انتہا پسند ہندو قوم پرست سے تباہ کن فرقہ وارانہ فساد میں مبتلا ہونے کی بجائے کسی روس جیسے اسلام دشمن سامراج سے مصروف جہاد ہوتے اور اس تقدیر شکن قوت کے لیے امریکی سرمایہ اور ہتھیار بفراغت مہیا ہوتے تو انہیں یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو بھی سینہ سے لگایا جاتا اور اسلامی اخوت و بھائی چارہ کا رشتہ استوار کیا جاتا۔ افسوس کہ وہ غلط میدان میں، غلط مقصد کے لیے جان دے رہے ہیں چنانچہ ان کے غم میں اتنا ہی شریک ہوا جا سکتا ہے جتنا ہم اور ہماری حکومت ہوئے ہیں یعنی احتجاج و احتجاج و احتجاج، قلمی بھی، زبانی بھی۔

بھارتی ہندو کے جارحانہ بلکہ قاتلانہ رویے کے خلاف

بطورِ ردِ عمل احتجاج کرنے والے سیاسی نابالغ اور جنت الحمقاء کے معززو معروف مکین عجب بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے طویل سیاسی عمل کے دوران اگر ہندو سے سیاسی تعلقات استوار ہوتے ہندو کی نیت پر بھروسہ ہوتا اور ہندو کو ستم پیشہ ظالم و ستمگر، نیز طوطا چشم، ابن الوقت اور مفاد پرست نہ سمجھا جاتا تو دو قومی نظریے کا کشف و انقاء کیوں کر ہوتا ________

اقبال، جناح کے مابین تاریخ ساز خط و کتابت کی نوبت کیوں آتی، قائدِ اعظم کی زیرِ قیادت آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا لاہور ریزولیشن کیوں پیش کیا جاتا، کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے اختتام پر "یوم نجات" کیوں منایا جاتا۔ برصغیر جنوبی ایشیاء دو نیم بلکہ سہ نیم کیوں ہوتا۔ ہندو تو ناقابل اعتماد تھا، مسلم دشمن تھا، اب پرانی بات کو دہرانا اور اس کے کسی ناپسندیدہ عمل پر زبانی کلامی احتجاج کرنا حماقت و نادانی کے علاوہ کیا ہے۔ کیا آل انڈیا مسلم لیگ لیڈر شپ کا خیال تھا کہ ہندو خراب ترین سلوک مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں سے اور بہترین انسانی سلوک، مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے ساتھ کریں گے کہ اکثریتی مسلم صوبوں پر مشتمل تو مملکتِ خداداد پاکستان قائم کرلی

اور اقلیتی مسلم صوبوں کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی
حکومت کے خفی و جلی وفادار رہیں - یہ اپنوں کے
دھتکار ہوئے مسلمان آخر کہاں جائیں اور کس سے
پناہ طلب کریں - آخر ان فراموش شدہ، دو قومی
نظریۂ پاکستان کے وفاداروں کا بھارت میں رہنما
کون تھا جو ان درماندہ مسلمانوں کو سول وار کے ہولناک
نتائج سے محفوظ رکھنے کی سعی کرتا، نئے حالات میں نئی
حکمتِ عملی وضع کرتا اور قیادت کا مشکل ترین فریضہ
ادا کرتا - کیا ان حیران و سرگردان اور گم کردہ راہ مسلمانوں
کا لیڈر چودھری خلیق الزماں تھا ؟ جن کے پاکستان
آنے کی کہانی فلمی یا جاسوسی کہانی سے کم پُراسرار،
حیرت انگیز اور شرمناک نہیں ، اگر بھارت میں داشتہ
آید بکار کی طرح چھوڑے ہوئے ششدر و مضطرب
مرحوم مسلم لیگی مسلمانوں کا لیڈر چوہدری خلیق الزماں ہی
تھا تو اُسے پاکستان میں قیام کی اجازت کیوں اور کس
اصول کے تحت دی گئی .....!

۲۵، ۲۶ اگست ۱۹۸۷ء کو کثیر الاشاعت جنگ کراچی میں " قراردادِ لاہور" کی تدوین اور ترمیم کی نسبت مشہور مسلم لیگی رکن اور سبجیکٹ کمیٹی کے ممبر محترم ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب (حال مقیم لندن) کا ایک وضاحتی خط شائع ہوا۔ درج ذیل استفساری خط ہے جو میں نے یکم ستمبر ۱۹۸۷ء کو انہیں لکھا موصوف سے درخواست کی تھی کہ امور مستفسرہ کی وضاحت و صراحت فرمائیں تاکہ حقائق تک پہنچنے میں سہولت ہو سکے:

گرامی خدمت ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب۔

۳۷ - بیبی ورن روڈ

ادلس کورٹ - ایس - ڈبلیو - ۵ - لندن

آپ کے خط بنام محترم ارشاد احمد حقانی صاحب اشاعتہ موقر جنگ کراچی ۲۵، ۲۶ اگست ۱۹۸۷ء سے قراردادِ پاکستان کی تیاری اور پیش کش کی نسبت دو تین اور باتیں سامنے آئی ہیں۔ آپ کے ارشاد کے مطابق:-

(۱) " قراردادِ پاکستان کا مسودہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو رات کے گیارہ بجے نواب صاحب ممدوٹ کے مکان پر چار آدمیوں نے مل کر تیار کیا تھا " یعنی قائدِ اعظم ۔ سر سکندر حیات ۔ نواب محمد اسماعیل خان ؒ اور ملک برکت علی۔

(۲) (سبجیکٹس کمیٹی کے اجلاس کے دوران) اس قراردادِ پر جو واحد ترمیم پیش کی گئی وہ میں نے پیش کی تھی جو اس وقت تو نہیں البتہ اپریل ۴۶ء کے کنونشن میں انہی خطوط پر منظور ہوئی :"

اور جناب شریف الدین پیرزادہ، سابق وزیرِ قانون حکومتِ پاکستان نے قرارداد کی تحریر و تیاری کی نسبت مسٹر ولی خان کے اس انٹرویو کے جواب میں جسے موقر جنگ کراچی نے معروز ہفت روزہ " چٹان " لاہور سے لے کر ۲۲ دسمبر ۱۹۸۱ء کو شائع کیا کہ " قراردادِ پاکستان سر ظفر اللہ خان نے ۱۲ مارچ ۴۰ء کو تیار کی تھی " مجلس شوریٰ

اسلام آباد میں ۱۷ر جنوری ۱۹۸۲ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "سر ظفر اللہ خان نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی جب کہ "قرار دادِ پاکستان" خود قائد اعظم نے تیار کی تھی"!

سات دن بعد، قرار داد کی تیاری کی نسبت مشہور مسلم لیگی رکن پیر علی راشدی (مرحوم) موقر جنگ، کراچی، ۲۴ر جنوری ۱۹۸۲ء رقمطراز ہوئے کہ:-

(۱) "دوسرے روز ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا، جہاں یہ اُصول منظور کر کے فیصلہ کیا گیا کہ ان ہی خطوط پر آنے والے آل انڈیا مسلم لیگ سیشن میں (جو لاہور میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو ہو رہا تھا) پیش کرنے کے لیے ایک قرار داد کا مسودہ تیار کیا جائے۔ یہ مسودہ قائد اعظم نے خود تیار فرمایا اور تیار ہو جانے کے بعد اُسے میرے حوالے کیا کہ میں لاہور جا کر سر سکندر حیات (مرحوم) کو دکھالاؤں۔ مسودہ لے کر میں سر موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ مولانا غلام رسول مہر مرحوم اور شیخ محمد عالم مرحوم بھی تشریف لے گئے۔ وہاں مہر مقبول مرحوم پہلے ہی موجود تھے۔ مسودہ دیکھا گیا اور سر سکندر حیات نے اُس کے مندرجات کو منظور کر لیا میں نے واپس (دہلی) جا کر یہ بات بتادی۔ یہ تھا اُس تاریخی قرارداد کا مسودہ جو ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے اجلاس میں مولوی فضل حق مرحوم نے پیش کی اور بالاتفاق منظور ہو کر قرار دادِ پاکستان کہلائی۔"

(۲) قرار داد کے مسودے میں اپنی پیش کردہ ترمیم کو (بلا سوچے سمجھے) شامل مسودہ کرلیے جانے کی نسبت موصوف نے لکھا:-

"میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ قرارداد کے ابتدائی مسودے میں ایک کمی رہ گئی تھی جس کو میں نے آخری وقت پر ایک چھوٹی سی ترمیم پیش کر کے سبجکٹ کمیٹی کی اسٹیج پر پورا کروالیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے

ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ ترمیم والی پرچی مسلم لیگ کے اُن کاغذات میں دیکھی گئی ہے۔ جو اس وقت جامعہ کراچی کی تحویل میں ہیں۔ ترمیم کا مضمون تھا:۔

"SUBJECT TO SUCH TERRITORIAL ADJESTMENTS—AS MAY BE FOUND NECESSARY."

اُس وقت قائدِ اعظم نے ترمیم دیکھتے ہی، بغیر بحث ، اُس کو اصل مسودے میں شامل فرما دیا۔ غالباً جناب پیرزادہ صاحب نے بھی میری لکھی ہوئی کاغذ کی وہ سلپ دیکھ لی تھی...... ۲۳ مارچ ۴۰ء کو یہ مسودہ بصورت قرار دادِ پاکستان لاہور سیشن نے منظور کر لیا۔ (میں پھر عرض کرتا ہوں کہ یہ مسودہ حضرت قائدِ اعظم نے خود تحریر فرمایا۔")

اس گلوٹینی ترمیم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے پاکستانی نقشے کو کنگوری شکل دی ڈرافٹنگ کمیٹی کے سینیئر رکن چودھری خلیق الزماں مرحوم نے اپنی مشہور تصنیف "شاہراہِ پاکستان" میں ایک سے زائد بار ذکر کرتے ہوئے کہا:۔

(۱) "یہ تجویز ایک سبجکٹ کمیٹی سے پاس ہو کر کونسل میں آئی تھی۔ خدا معلوم اس کو سبجکٹ کمیٹی میں سر سکندر حیات اور مسٹر جناح نے کیسے منظور کر لیا۔"

(۲) مگر مقامِ حیرت ہے کہ ساری قرار داد میں لفظ "صوبہ" سے اس قدر احتراز کیا گیا ہے کہ کہیں ایک جگہ بھی یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ ایسے ذو معنی اور غیر متعین الفاظ جیسے "ریجن" اور "زون" ZONES بار بار استعمال کیے گئے ہیں...... شاید اس لیے کہ صوبے کے لفظ کے ساتھ ساتھ بڑے اقطاع کے لین دین کے الفاظ کھپ نہیں سکتے تھے۔

کے استعمال کی معنویت یا خطرناک نتائج چاہے اُس وقت مرتبین کے ذہن میں نہ ہوں، بہرحال اِن الفاظ نے ہندو انڈیا کو یہ پرمٹ دے دیا کہ بھئی، جس وقت تمہارا جی چاہے اسی کو بنیاد بنا کر پنجاب اور بنگال وغیرہ کی تقسیم کا دعویٰ کر دینا۔ نتیجہ یہ کہ چار کروڑ کی مسلم اقلیت ہندو ہندوستان کے نرغے میں پھنس گئی اور جب وقت آیا تو انہیں بھاگ نکلنے کا راستہ بھی نہ مل سکا۔ میں آج (۲۶) برس قبل کے اس ریزولیشن کے الفاظ کو غور سے پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم چلے تھے کُل صوبۂ پنجاب کا دعویٰ کرنے اور ہم نے عرضی دعویٰ ہی میں اپنا پچاس فیصد دعویٰ قلم زد کر دیا..... اور اس طرح جب تقسیم ہوئی ـــــ چودھری صاحب نے لکھا ـــــ ہمیں کٹا پٹا پاکستان بھی نہیں ـــــ "پاستان" ملا۔ کیوں کہ کشمیر کا "ک" انڈیا کو گیا ـــــ" (عت ۷۹۶)

متذکرہ محترم و بلند پایہ شخصیات کے بیانات میں جب اس قدر تضاد موجود ہو تو پھر سند کے مستند ہونے کی سند کس سے لیجائے جب کہ سرکاری طور پر بھی عمداً یا مصلحتاً اغماض برتا جارہا ہے کہ ہر بدلتے دورِ حکومت میں ان اہم اور مستند دستاویزات کو نقصان پہنچا ہے

بات پھر کے وہیں، اسی سوال پر آجاتی ہے کہ " قرار دادِ پاکستان کا مرتب کون ہے" ـــــ ؟

معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں اقطاعِ ارض سے بھی اس نوع کے مزید سوالات ڈاکٹر صاحب موصوف سے کئے گئے تھے۔ روز نامہ جنگ کراچی، ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی وساطت سے موصوف کا جو وضاحتی خط "قرار دادِ پاکستان کی تدوین ـــــ چند حقائق ـــــ" کے عنوان

سے شائع ہوا ہے وہ ہدیہ قارئین ہے۔

جب سے میرا خط ۲۲ اگست ۱۹۸۷ء کے "جنگ" میں شائع ہوا ہے میری روزمرہ کی ڈاک میں چار گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اکثر خط پاکستان کے مختلف شہروں سے آتے ہیں۔ چند خط امریکہ سے اور چند خط یورپ کے دوسرے ملکوں سے بھی آئے ہیں۔ غرضیکہ جہاں جہاں اخبار "جنگ" پڑھا جاتا ہے وہاں سے خطوں کا تانتا بندھ گیا ہے ہر شخص کم و بیش ایک ہی قسم کا سوال کرتا ہے مثلاً

(۱) ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کا اصل مصنف اور مرتب کون تھا؟

(۲) یہ قرارداد انگریزی میں لکھی گئی تھی یا اردو میں؟

(۳) سبجیکٹس کمیٹی میں بحث کس روز ہوئی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے کھلے اجلاس (اوپن سیشن) میں یہ قرارداد کس روز پیش ہوئی تھی اور کس نے پیش کی تھی۔؟

(۴) میری ترمیم جو میں نے ۲۳ مارچ کو سبجیکٹس کمیٹی میں پیش کی تھی کیا تھی؟ چودھری خلیق الزمان صاحب مرحوم نے اپنی انگریزی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں اس قرارداد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟

میں مصروف آدمی ہوں اور عدیم الفرصت بھی ہوں۔ اس لئے فرداً فرداً ہر شخص کو جواب نہیں دے سکتا۔ مناسب یہی ہے کہ آپ کے اخبار کی وساطت سے سب کو اکٹھا جواب دے دوں اس طرح آسانی رہے گی۔

جیسا میں نے پہلے اپنے خط میں عرض کیا تھا۔ اس قرارداد کا مسودہ نواب صاحب ممدوٹ کے مکان پر ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو رات کے گیارہ بجے تیار کیا گیا تھا اس کام میں چار آدمی

شامل تھے یعنی قائداعظمؒ سر سکندر حیات خان، نواب محمد اسماعیل خان اور ملک برکت علی، سر سکندر ایک بنی بنائی قرارداد کا مسودہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو ان کی زونل اسکیم کے خاکے پر تیار کیا گیا تھا۔ قائداعظمؒ نے وہ مسودہ شروع ہی سے مسترد کر دیا تھا۔

اس واقعہ کے سال بھر بعد ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو سر سکندر نے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے آئین کے بارے میں ایک ایسی تجویز پیش کی جو قرارداد پاکستان کے برعکس تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز پر قائم کی جائے۔ جہاں ہر یونٹ کو مکمل حکومت خود اختیاری حاصل ہو۔ البتہ مرکز کو ایک قسم کا ایجنسی سینٹر بنا دیا چاہیئے جسے فیڈریشن کے مختلف یونٹ اپنی اپنی نمائندگی کے لئے کچھ اختیارات عطا کر دیں۔

سر سکندر نے یہ اسکیم پیش کرتے وقت یہ بھی کہا کہ پنجاب مسلم لیگ کو چاہیئے کہ میری اس تجویز کے مطابق قرارداد لاہور میں ترمیم کرانے کی کوشش کرے چنانچہ نواب شاہنواز خان ممدوٹ نے جو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر تھے اور پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی تھے وہیں ایوان میں اعلان کیا انہوں نے اس قسم کی ترمیم کا مسودہ قائداعظمؒ کو بمبئی بھیج دیا ہے۔

لاہور کے مشہور اینگلو انڈین اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو ایک لیڈنگ آرٹیکل لکھا جس کا عنوان تھا "نیا پاکستان" اور سر سکندر کی اس تجویز پر تنقید بھی کی اور اس کی تعریف بھی کی۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ سر سکندر حیات خاں کو چاہیئے کہ اپنے لئے ایک مستقل مقام متعین کریں یا آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی تائید کریں یا آئندہ آئین کے بارے میں کوئی اور محکم اسکیم مرتب کر کے اس کی پابندی فرمائیں یہ بار بار پہلو بدلنا اور روز نئی نئی اسکیمیں پیش کرنا مناسب نہیں۔

ملک برکت علی نے ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو سر سکندر کی اس تجویز کے خلاف ایک اخباری بیان دیا جو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ہی شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اس تجویز کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار داد پاکستان کی ترتیب و تدوین اور منظوری میں وزیراعظم پنجاب شریک تھے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے کس بے رخی اور آسانی سے اس قرار داد کو اٹھا کر پرے پھینک دیا ہے۔ انہوں نے ٹھیک کہا ہے کہ قرار داد کا پہلا مسودہ انھی سے مرتب کیا تھا جس میں ایجنسی سینٹر کا ذکر موجود تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ نے بھی اس ایجنسی سینٹر کو مسترد کر دیا تھا اور انجام کار قرار داد لاہور مرتب کی گئی تھی جس سے سر سکندر نے اتفاق فرمایا تھا۔ میری درخواست ہے کہ انہیں چاہیئے کہ مسلم لیگ کے اس ریزولیوشن کی جو قرار داد لاہور کے نام سے موسوم ہے، پابندی کریں اور اس میں مین میخ نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سر سکندر نے اپنی تقریر میں پنجاب مسلم لیگ سے کہا ہے کہ ان کی موجودہ تجویز کی روشنی میں قرار داد لاہور میں ترمیم کرانے کی کوشش کی جائے۔ تعجب ہے کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر نے وہیں ایوان میں اعلان کر دیا کہ انہوں نے سر سکندر کی تجویز کے مطابق ترمیم کر کے بالائی حلقوں میں بھیج دی ہے۔ میرا فرض ہے کہ لوگوں کو بتاؤں کہ اس قسم کی ترمیم کے منظور ہونے کا قطعی کوئی امکان نہیں۔ مسلم لیگ کیا محض کوئی سیاسی جماعت بھی اپنی منظور شدہ قرار دادوں کو اس طرح نہیں بدلا کرتی۔ مسلم لیگ سر سکندر کے مجوزہ ایجنسی سنٹر کی تجویز اچھی طرح غور کر کے اسے مسترد کر چکی ہے۔ اب اس مردے کو قبر سے نکالنے کا کچھ فائدہ نہیں"

ملک صاحب کے اس بیان سے ان تمام غلط فہمیوں اور ان تمام شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جانا چاہیئے جو بعض لوگوں نے عمداً یا سہواً پھیلا رکھی ہیں کہ قرار داد پاکستان کی ترتیب و تدوین وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ اور ممبر ایگزیکٹو کونسل سر ظفر اللہ خان کے باہمی مشورے سے تیار کی گئی تھی۔ بعض ایسے نوجوانوں کو بھی میں جانتا ہوں جو مارچ ۱۹۴۰ء میں بمبئی اور الہ آباد کے کسی اسکول کے طالب علم تھے یا کالج کی فرسٹ ایئر کلاس میں پڑھتے تھے اور جنہیں قرار داد پاکستان کی تدوین و تصنیف کا قطعی کوئی علم نہیں اور جو ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں پہلی بار

مہاجر کی حیثیت سے پاکستان میں وارد ہوئے تھے۔ حیرت ہے کہ یہی نوجوان آج بڑے وثوق سے
یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرارداد پاکستان مرتب کرنے میں ان کا بھی حصہ ہے اور وہ اس قرارداد
کے شارح اور مفسر بن کر اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہیں۔

(۲) قرارداد پاکستان کا اصلی متن انگریزی میں تھا۔ ۲۲، مارچ، ۱۹۴۰ء کو رات کے وقت
جب سبجیکٹس کمیٹی میں بحث شروع ہوئی تو بعض لوگ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے
اعتراض کیا کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیجئے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے وہی کاغذ مولانا ظفر علی خان
کے حوالے کر دیا کہ آپ سے بہتر ترجمہ کون کر سکے گا۔ مولانا نے وہیں بیٹھے بیٹھے بڑی خوبصورت اور
نستعلیق اردو میں ترجمہ کیا۔ متن میں ایک لفظ زون ZONES بار بار آتا ہے مولانا نے اس کا
ترجمہ منطقہ کیا۔ میں نے اجلاس ختم ہونے کے بعد مولانا کو مبارکباد پیش کی کہ ترجمہ تو میں بھی کر
سکتا تھا۔ لیکن یہ صحیح جغرافیائی اصطلاح منطقہ غالباً مجھے نہ سوجھتی۔ مولانا ہنس پڑے۔

(۳) سبجیکٹس کمیٹی میں ۲۲، مارچ رات کو گیارہ بجے تک بحث ہوتی رہی پھر ۲۳، مارچ
کو صبح دس بجے سے ایک بجے دوپہر تک بحث جاری رہی۔ اس طویل بحث کے بعد قرارداد منظور
ہوئی۔ مسلم لیگ کا کھلا اجلاس ۲۳، مارچ کو چار بجے سہ پہر کے وقت ہوا جہاں یہ قرارداد بنگال
کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق صاحب نے پیش کی۔ مولوی صاحب نے نہایت فصیح و بلیغ اردو
میں تقریر کی اور مسلمانوں کی تکلیفوں کا ذکر کرتے ہوئے انوری کے یہ دو شعر بھی پڑھے۔

ہر بلائے کز آسمان آید ..... گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پرسد ..... خانۂ انوری کجا باشد

رات کے بارہ بجے سبجیکٹس کمیٹی کا اجلاس ختم ہوا تو ملک برکت علی اور میں ایک ہی موٹر
میں واپس آئے۔ میں ان دنوں ٹمپل روڈ پر ملک صاحب کے پڑوس میں رہتا تھا۔ راستے میں،
میں نے ان سے کہا کہ قرارداد کے الفاظ میں کچھ نقص ہے۔ آپ رفع کرا دیجئے۔ انہوں نے پوچھا
کیا نقص ہے۔ میں نے عرض کیا "پہلے یہ بتائیے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے سے، جس کو

آپ اپنی مجوزہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی مراد کیا ہے؟" کہنے لگے "یہی پنجاب سرحد، بلوچستان اور سندھ" میں نے کہا "تو پھر آپ قرارداد میں واضح طور سے ان صوبوں کے نام کیوں نہیں لیتے"

بولے "اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے عرض کیا "آپ کو معلوم ہے کہ پورے پنجاب میں ہماری اکثریت نہیں۔ دس گیارہ ضلعے ایسے ہیں جہاں ہم اقلیت میں ہیں اگر آپ نے علاقائی ردوبدل "TERRITORIAL ADJESTMENTS" کے ساتھ مسلمانوں کی اکثریت کے حصے کو باقی ملک سے علیحدہ کیا تو نصف کے قریب پنجاب کٹ جائے گا۔ حالانکہ قرارداد مرتب کرتے وقت پورا پنجاب آپ کے ذہن میں تھا، اول یہ کیجئے کہ جہاں آپ نے شمال مغربی ہند کا ذکر کیا ہے وہاں پنجاب سندھ سرحد اور بلوچستان کے نام صراحت سے لینا چاہئیں اور دوسرا یہ کہ علاقائی ردوبدل "TERRITORIAL ADJUSTMENTS" کے الفاظ حذف کر دیجئے۔

ملک صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور قرارداد کی ترتیب و تصنیف میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ اس لئے ضابطے کے مطابق وہ قرارداد پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے تاہم انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دوسرے روز اسی مضمون کی ترمیم پیش کر دوں۔

دوسرے روز ۲۳ مارچ کی صبح کو بحث شروع ہوئی تو میں نے ترمیم پیش کی۔ اور تفصیل سے اپنا نقطۂ نگاہ بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ لوگ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو مجوزہ مملکتوں میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جہاں آپ نے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں کا ذکر کیا ہے وہاں صاف لفظوں میں ان صوبوں کے نام لیجئے تاکہ ہمارے مخاطب اور مخالف دونوں ہمارے مطالبے کی حقیقت ابھی سمجھ جائیں ورنہ علاقائی ردوبدل کے تحت پنجاب اور بنگال کا قریباً نصف حصہ کٹ جائے گا۔

میری اس ترمیم کا جواب نوابزادہ لیاقت علی خان نے دیا اور فرمایا ہم نے ایک مصلحت کی وجہ سے صوبوں کے نام نہیں دیے۔ اگر ہم پنجاب کا نام لے لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری مملکت کی سرحد گوڑگاؤں تک ہوگی حالانکہ ہم علاقائی حدود بال کے تحت دہلی اور علی گڑھ کو جو ہماری تہذیب اور تعلیم کے مرکز ہیں مجوزہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیے علاقائی حدود کا یہ مطلب نہیں کہ پنجاب کا کوئی حصہ ہم کو دینا پڑے گا۔

نوابزادہ صاحب کے اس جواب پر ایوان میں خوب تالیاں بجیں۔

چودھری صاحب مرحوم میرے دوست تھے وفات پا چکے ہیں ایک نہ ایک دن میں بھی اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں لیکن واقعات بہرحال واقعات ہیں جن سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ چودھری صاحب نے اپنی انگریزی کی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں لکھا ہے کہ:

"مسلم لیگ کی تمام قراردادوں میں محکم ترین تھا صرف یہی ایک قرارداد پاکستان تھی جو بدقسمتی سے میں نہ دیکھ سکا نتیجہ یہ ہوا کہ قرارداد بالکل غلط انداز میں مرتب کی گئی اور کسی نے سوچا کہ ان الفاظ سے قرارداد کا مفہوم یکسر بدل نہیں بگڑ کر رہ جائے گا۔ کاش ورکنگ کمیٹی کے ارکان میری آمد کا انتظار کرتے تاکہ میں اپنے وسیع سیاسی تجربے کی بنا پر قرارداد صحیح الفاظ میں مرتب کرتا۔"

یہ صحیح ہے کہ چودھری صاحب ۲۱ مارچ کو نہیں ۲۲ مارچ کو لاہور میں تشریف لائے تھے (کیونکہ میں نے ان کو ۲۲ ہی کو دیکھا تھا) اور قرارداد کا مسودہ ۲۱ مارچ کی رات کو لکھا گیا تھا گزارش یہ ہے کہ اگر چودھری صاحب کے نزدیک قرارداد غلط مرتب ہوئی تھی تو انہوں نے ۲۲ مارچ کو لاہور پہنچ کر جب قرارداد کا مسودہ دیکھا تو کیوں اعتراض نہ کیا اور اپنے محکم دلائل کی بنا پر جن کا اظہار انہوں نے اپنی گراں قدر تصنیف میں کیا ہے کیوں اپنے رفقاء کار سے نہ کہا کہ غلط قرارداد اجلاس میں پیش کرنے سے پہلے اس کے الفاظ درست کر لو۔ چودھری صاحب نے ایک غلط قرارداد کو بطیب خاطر قبول کیا اور اسے غلط سمجھتے ہوئے بھی کھلے اجلاس میں ایک لاکھ کے مجمع کے سامنے اس کی تائید کی۔ لامحالہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چودھری صاحب واقعی

بیٹھے تھے کہ قرار داد غلط ہے تو اس کی تائید انہوں نے کیوں کی؟

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک جزو ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی اب میں اپنی پہلی گزارش کا یہاں پھر اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ تلخ کلامی اور دشنام طرازی کو جس نے ہماری "پبلک لائف" کو پراگندہ کر رکھا ہے خدارا جلد بند کر دیجئے ہر شخص دوسرے شخص پر غداری اور وطن دشمنی کا الزام لگا رہا ہے عوام پریشان ہیں کہ وہ کدھر جائیں اور کس کی پیروی کریں۔

میں بعض اوقات دور بیٹھا سوچتا ہوں کہ جس ملک میں یہ طوائف الملوکی برپا ہو وہاں ہم ایسے گناہ گاران ازلی اپنی حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ لینے کے لئے کس کے پاس جائیں اور کس کے آستان پر حاضری دیں؟ فوج کے جرنیلوں کے پاس؟ سی ایس پی افسروں کے پاس؟ کروڑ پتی سیٹھوں کے پاس؟ پولیس کے انسپکٹر جنرل کے پاس؟ اقبال نے سچ کہا تھا

میر سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف

آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

نیاز مند قدیم

عاشق حسین بٹالوی

اور کچھ ہو نہ ہو، چودھری صاحب اور جناب بٹالوی صاحب میں ایک قدرِ مشترک ضرور ہے۔ انہیں اگر اپنے کارنامہ "شاہ راہِ پاکستان" کے لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب وہ اپنی عمر کے (۷۰) سال کے سنگِ میل پر ہانپ رہے تھے تو جناب بٹالوی صاحب کو اپنی عمر کے (۸۰) ویں ریچ اسٹون پر وضاحت کا وہ فرض یاد آیا جو اگر شاہ راہِ پاکستان کی پہلی انگریزی جلد کی اشاعت پر آجاتا تو اتنا عرصہ ہمیں سرگرداں پھرنا نہ پڑتا۔ حیرت ہے کہ پہلی اشاعت ہی پر جب موقر اخبارات نے احتجاج کیا ___ ڈاکٹر صاحب موصوف اور ہم عصر کہاں تھل رہے تھے۔ اگر محترم ولی خان نے اپنا ولایتی بیان اخبارات کو جاری نہ کیا ہوتا تو ہو سکتا ہے

سے واضح ہوتا ہے جو انہوں نے اخبار "اسٹیٹس مین" کلکتہ میں ۳ اگست ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

"جناب والا۔ آج کی اشاعت میں آپ نے پی۔ شیو راؤ صاحب کا بہترین مضمون شائع کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ گذرے ہوئے تاریخی واقعات کی یاد دہانی کی ایک عمدہ مثال ہے بلکہ ماضی کے اس تاریک دور پر روشنی ڈالتا ہے جو ظلمت ہونے کے باوجود خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

۱۹۳۰ء میں بمقام شملہ مسٹر جناح اور ان کی بہن نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے ہاں لنچ پر مدعو کیا۔ اس وقت ہم چاروں کے علاوہ وہاں کوئی پانچواں شخص موجود نہ تھا۔

مسٹر جناح نے مجھ سے کہا :۔

"کانگریس مجھے بقیہ دو آنے بھی کیوں نہیں دیتی"۔ ؟

میں نے جواب دیا "یہ ایک مالیاتی مسئلہ ہے"

مسٹر جناح نے پھر کہا :۔

درحقیقت آپ لوگ چاہتے کیا ہیں ؟ فرقہ وارانہ فسادات نے ہمیں روپیہ میں چودہ آنے تو بخش دیئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بقیہ دو آنے بھی دے دیئے جائیں"

میں نے مسٹر جناح سے اس مطالبے کے الجھاؤ کی تفصیل کے بارے میں دریافت کیا۔

انہوں نے جواب دیا :۔

"سب سے پہلے تو میں مخلوط انتخاب چاہتا ہوں"

یہ سنتے ہی میرے حواس اُڑ گئے اور میرے ہاتھ سے کانٹا جس سے میں کھا رہا تھا کھانے کی میز پر چھوٹ گیا ——— مسٹر جناح آگے کہہ رہے تھے:۔

اس کے بعد میں یہ چاہتا ہوں کہ مرکز میں مسلمانوں کو ساڑھے تینتیس فیصد نمائندگی حاصل ہو اور اسی طرح یو۔پی۔ بہار اور دوسری جگہوں پر بھی مناسب اہمیت دی جائے۔"

میرا جواب یہ تھا کہ اگر وہ مخلوط انتخاب کو منظور کر لیتے ہیں تو غالباً کانگریس مرکز میں (۵۰) فی صدی تک نمائندگی دینے سے گریز نہ کرے گی۔"

یہ سُن کر مسٹر جناح نے کہا:۔

"اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم مسٹر گاندھی کو اس بات پر رضامند کر لو۔"

چونکہ تجویز حد سے زیادہ عمدہ اور حقیقت پر مبنی تھی اس لئے مجھے خود اپنے اوپر بھی بھروسہ نہ تھا۔ اس بات کے مدِ نظر آنجہانی رائے زادہ ہنس راج سے جو مسٹر جناح کے بھی اچھے دوست تھے، میں نے کہا کہ وہ اس خبر کو جانچیں ——— انہوں نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ایک خط جس پر رائے زادہ ہنس راج کے بھی دستخط تھے، گاندھی جی کو روانہ کیا جس میں میرے اور مسٹر جناح کے درمیان ہونے والے گفتگو کا پورا متن موجود تھا جواب میں، میں نے گاندھی جی کا ایک تار وصول کیا جس کی تحریر مندرجہ ذیل تھی:۔

"خط ملا۔ مزید ہدایات کا انتظار کرو۔"

جسے پڑھ کر میں سکتہ میں آ گیا۔ ایک ایسی تجویز جیسی کہ مسٹر جناح نے پیش کی تھی ایسی تھی جو فوراً، بغیر کسی حیل وحجت کے منظور کر لی جانی چاہیئے تھی۔ میں نے سوچا کہ غالباً اس سلسلے میں گاندھی جی مسٹر نہرو سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا میں نے جو کچھ مسٹر گاندھی کو لکھا تھا نہرو کو بھی لکھ بھیجا۔

مسٹر نہرو کا ردِ عمل بہت ہمت شکن تھا۔ وہ کانگریس کی اٹھائی ہوئی ہمہ گیر تحریک سے

بہت متاثر تھے۔ میں نے دوبارہ انہیں لکھا کہ یہ قطعی غیر ممکن ہے کہ محمود ین صاحب کو سرِ راہ یہ باور کرایا جائے کہ وہ عوام کے نمائندے ہیں۔ برخلاف اس کے مسٹر جناح کی آواز سارے مسلمانوں کی آواز بھی جا سکتی ہے لہٰذا کیوں نہ ان سے ہی معاملات کر لئے جائیں۔

اس کے جواب میں مسٹر نہرو نے لکھا کہ:۔

"میں اپنے پرانے فیصلے پر ہی بدستور قائم ہوں البتہ مسٹر جناح سے ملاقات کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

مگر مسٹر جناح گاندھی جی سے سارے معاملات طے کرنا چاہتے تھے۔ نہرو سے نہیں لیکن گاندھی جی نے مجھے لکھا کہ:۔

"میں تو کانگریس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں ۔۔۔۔ اور یہ کہ مجھے کوئی امید بھی نظر نہیں آتی، لہٰذا بہتر موقع کا انتظار ہی مناسب ہے۔"

میرے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں تھا جو مسٹر جناح نے فراہم کیا تھا۔ اس طرح اس گفتگو کا اختتام ہوا جس نے ہو سکتا ہے کہ موجودہ واقعات کا رخ ہی بدل دیا ہوتا۔"

جہاں تک میرا خیال ہے مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی میں سے کوئی بھی تقسیم کا حامی نہ تھا۔ میرے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لینے کے بعد جب مسٹر جناح کشمیر سے واپس آ رہے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم مہاتما گاندھی کو جو اس وقت پونا میں زیر حراست تھے،[1] لکھو کہ "اگر نظریہ پاکستان قابل قبول ہو تو میں تقسیم ملک کا مطالبہ نہیں کروں گا۔" اتفاق سے

---

(۱) اگست ۴۲ تا ۴۴

ڈاکٹر بھارگو اپونا نہ جاسکے اور اس طرح میرا خط بھی گاندھی جی کو نہ پہنچ سکا......" دیوان چمن لعل نئی دہلی ۱۵ر اگست (۱)

چودھری صاحب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اٹل ارادے والا قائد "مہاطمع" کی طرح کا کوئی ڈھلمل سیاست دان نہیں تھا، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ "قرار داد لاہور" کے بعد کسی بھی عرصے میں دیوان چمن لعل سے کہا ہو کہ:۔

"گاندھی کو لکھو کہ اگر نظریۂ پاکستان قابل قبول ہو تو میں تقسیم ہند کا مطالبہ نہیں کروں گا۔"

دم آخر، اپنی مغفرت کی دعا کے بجائے چودھری صاحب نے دوسری اشاعت کے اس اوچھے وار کے ذریعے قائد کا تو کیا خود اپنا امیج اور بھی خراب کر لیا ہے۔ بہر حال ہیر، تو ان کی آخرت ہی بہتر ہونے کی دعا کرنی چاہیے۔

---

(۱) تسلسل کے لیے دیوان صاحب کے اصل خط کی ترتیب کچھ اسی طرح صحیح رہے گی۔

مصنف کی زیرِ طبع کتابیں

(۱) سید الانبیاء "کلکی اوتار" کتبِ مقدسہ اور "ہادیانِ قوم" کے مستند حوالوں کے ساتھ۔

(۲) نازی چانسلر ___ فیوہرر اڈولف ہٹلر کی پیدائش سے لے کر دوسری جنگِ عظیم کے اعلانِ جنگ تک مستند کتابوں اور ہٹلر کی تقاریر و نازی جنگی حکمتِ عملی کے حوالوں کے ساتھ مصنف کے منفرد طرزِ تحریر میں پڑھیے۔ جس کے اندازِ بیان پر موقر "چٹان" لاہور نے یوں تبصرہ کیا تھا۔

"اردو زبان میں اپنے طرز کی پہلی تحریر"